معارف کا زرتعاون

لانہ سو روپے فی شمارہ دس روپے

دوسو پچاس روپے

الانہ ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

: حافظ محمد یحیٰی شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ۔ کراچی

بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADE

خ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہنچے تو اس

فتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہئے اس کے بعد رسالہ

رسالہ کے لفافہ پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

م پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

رقم پیشگی آنی چاہئے۔

جلد ۱۶۸ ماہ جمادی الاول ۱۴۲۲ھ مطابق ماہ اگست ۲۰۰۱ء عدد ۲

فہرست مضامین

شذرات

گذشتہ مہینے ان صفحات میں عرض کیا جاچکا ہے کہ حکومت مسلمانوں کے بارے میں سنجیدہ اور مخلص نہیں ہے، وہ ان کی معاشی
ل حالی اور تعلیمی پس ماندگی پر کرب و بے چینی تو ظاہر کرتی ہے مگر تعلیم و معیشت اور قومی زندگی کے اکثر شعبوں میں ان کے
خواہ مخواہ کی رکاوٹیں و پیچیدگیاں پیدا کرکے ان کی مشکلات اور دشواریاں بڑھا رہی ہے جس سے ان کی خستہ حالی اور
س ماندگی میں بھی مزید اضافہ ہو رہا ہے، عربی مدارس کے ساتھ اس کا نازیبا سلوک اور ان کے ذمہ داروں کو تنگ و پریشان
ے کا معاملہ بھی زیر بحث آیا تھا اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ سرکاری تعلیمی مراکز اور اکثریت کے زیر انتظام چلنے والے اداروں کے
ازے اقلیتوں کے لئے یا تو سر بند ہیں اور اگر اتفاقاً اس طرح کے کسی ادارے سے وہ اکا دکا وابستہ بھی ہیں تو اسی طرح جیسے
یں نمک ہوتا ہے، رہے مسلمانوں کے اپنے قائم کردہ کالج اور یونیورسٹی تو ان کے اقلیتی کردار کو ختم کرنے اور ان کے امتیاز و تشخص
نے لئے حکومت اور اس کی مشنریاں ہر وقت حرکت میں رہتی ہیں، اس وقت شیڈول کاسٹ کے لئے ریزرویشن
یتوں کے استحصال و پامال کرنے اور ان کی پس ماندگی بڑھانے کا بہانہ بنایا جارہا ہے۔

ہندوستان میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کا سب سے بڑا، نہایت ممتاز اور بین الاقوامی شہرت کا حامل تعلیمی ادارہ ہے، یہ
تان کی سیکولرازم اور اس کی عظمت کا نشان بھی ہے، اگر اس پر کوئی آنچ آئی اور اس کا تعلیمی کردار مجروح ہوا تو اس سے پوری
ں ہندوستان کی رسوائی اور بدنامی ہوگی اور اس کی جمہوریت اور سیکولرازم کا بھرم جاتا رہے گا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
د احمد خاں مرحوم نے آکسفورڈ کی اقامتی یونیورسٹی کے طرز پر قائم کیا تھا جسے برٹش حکومت کے زمانے میں ۱۹۲۰ء میں
یٹ کے تحت یونیورسٹی تسلیم کیا گیا تھا اس میں اس کی صراحت تھی کہ یہ ادارہ مسلمانان ہند کی تعلیمی ترقی کے لئے وجود میں
ہے گویا یہ یونیورسٹی دوسری مرکزی یونیورسٹیوں سے علانیہ مختلف ادارہ ہے، یہ اقلیتی تعلیمی ادارہ مسلم اقلیت کے لئے قائم کیا
قانوناً تسلیم شدہ ہے اور اقلیتی تعلیمی اداروں کو دستور میں بنیادی حق حاصل ہے جب کہ شیڈول کاسٹ وغیرہ کے لئے
کوئی بنیادی دستوری حق نہیں ہے اس لئے مسلم یونیورسٹی اور دوسرے اقلیتی اداروں کو ریزرویشن سے حکومت کو مستثنیٰ
ئے ورنہ چیخ پکار مچے گی اور فضا مسموم ہوگی کیونکہ جب بھی مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو ختم کرنے کی کوشش

کی گئی تو اس کی سخت مذمت کی گئی اور سارے مسلمانوں میں کہرام مچ گیا اور شدید اضطراب پیدا ہوا۔

اس وقت مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار بھنور میں آگیا ہے، طلبہ کے داخلوں و تدریسی و غیر تدریسی عملہ کے تقرر میں دلت اور پس ماندہ طبقوں کے لئے ریزرویشن کی پالیسی نافذ اور مسلط کی جانے والی ہے اور پارلیمنٹری کمیٹی برائے ویلفیر شیڈول کاسٹس اور شیڈول ٹرائیبس اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے ۲۲ ½ فیصدی سیٹیں ریزرو کرنے کے لئے مسلسل دباؤ ڈالا جارہا ہے اور یو جی سی نے مسلم یونیورسٹی کی گرانٹ کا ایک حصہ روک بھی دیا ہے، یکم جولائی ۲۰۰۱ء کو کورٹ کے سالانہ جلسے میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا تو ممبروں نے اس پر بڑی بے اطمینانی اور سخت تشویش ظاہر کی کیونکہ اس سے لامحالہ یونیورسٹی کا اقلیتی کردار مجروح ہوگا، اس لئے ممبروں نے وائس چانسلر جناب محمد حامد انصاری کو ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی کی تشکیل کا اختیار تفویض کیا تاکہ وہ درج فہرست ذاتوں اور قبائل کو یونیورسٹی کے مختلف کورسز میں نشستوں میں ریزرویشن کے بارے میں پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ اور سفارشات پر غور و خوض کرکے ہر مکتب فکر کے اشخاص، قومی رہنماؤں، ممبران پارلیمنٹ اور ارباب حکومت سے مذاکرات کرے اور ریزرویشن کے معاملے میں یونیورسٹی کی مجبوری اور دشواری سے انہیں آگاہ کرے اور ان کی تائید و حمایت سے ریزرویشن کے نفاذ سے یونیورسٹی کو مستثنیٰ کئے جانے پر حکومت کو آمادہ کرے۔ ممبران نے وائس چانسلر صاحب سے درخواست کی ہے کہ کمیٹی کی رپورٹ اکتوبر میں ہونے والے کورٹ کے جلسے میں پیش کریں، ان کے آفس سے اطلاع ملی ہے کہ کمیٹی کی تشکیل ہوچکی ہے۔

اترپردیش کا الکشن قریب آگیا ہے تو وزیر اعلیٰ راج ناتھ سنگھ کا جذبہ ترحم بھی بھڑک اٹھا ہے اور وہ دلتوں اور غریبوں پر نہایت مہربان ہوگئے ہیں جنھیں پہلے ہی ریزرویشن اور دوسری سہولتیں حاصل تھیں مگر وزیر اعلیٰ اسے ناکافی سمجھ کر انہیں مزید رعایتیں دینا چاہتے ہیں جو خوش آیند بات ہے، اس پر کیا اعتراض ہو، اعتراض تو اس پر ہے کہ ان کے مراحم خسروانہ دوسرے کمزور طبقوں اور اقلیتوں کے آئینی حقوق سلب کر رہے ہیں، ان کی حکومت کو مسلمانوں کی پس ماندگی کا اعتراف ہے اور اسے اس کی بھی خبر ہے کہ عام یونیورسٹیوں میں مسلم طلبہ کو داخلہ نہیں ملتا اس لئے اگر وہ واقعی ان کی تعلیمی ترقی کی خواہش مند ہوتی تو اقلیتی اداروں میں ریزرویشن کا چکر نہ چلاتی اور مسلم یونیورسٹی کو اس کی زد سے محفوظ و مستثنیٰ کر دیتی حقیقت تو یہ ہے کہ پس ماندگی کی

...نا پر مسلمانوں کو بھی ریزرویشن ملنا چاہئے اور دلتوں اور پس ماندہ طبقوں کی رعایتوں کو اس میں
...ائل نہیں ہونے دینا چاہئے، بی۔ جے۔ پی کی سربراہی والی مرکزی حکومت کے ایک بڑے کابینی
...یر مسٹر رام ولاس پاسوان کہتے ہیں" میں اور میری پارٹی کا یقین ہے کہ مسلمان بحیثیت فرقہ ملک کا سب سے
...دہ کمزور اور پس ماندہ حصہ ہیں اس لئے انہیں آبادی کے دوسرے حصوں کے برابر لانے اور انہیں ترقی
...واقع دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں ان کے لئے ریزرویشن کا انتظا...
...یا جائے" پتہ نہیں ریزرویشن کی بات کس مجبوری کی بنا پر کہی گئی ہے ورنہ وہ بھی جانتے ہیں کہ ان کی حکومت
...ں کو منڈھے نہ چڑھنے دے گی اگر ان کو واقعی مسلمانوں سے ہمدردی ہے تو اقلیتی کردار کو ختم اور مسلم
...ٹی کی شناخت مٹا دینے والے ریزرویشن کے حکم سے اس کو مستثنیٰ کئے جانے پر اپنی حکومت کو آمادہ کریں۔

شیڈول کاسٹ کے لئے ریزرویشن کے حکم کی وجہ سے پرائمری سے لے کر کالجوں اور یونیورسٹیوں
...ردو فارسی اور عربی اساتذہ کا تقرر برسوں سے رکا رہتا ہے اور بے چارے طلبہ کا نقصان ہوتا ہے بہت سارے
...ہش کے باوجود ان مضامین میں داخلہ نہیں لیتے اور لینے والے بد دل ہو کر ان مضامین کو چھوڑ
...نے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں آئے دن اخباروں میں اس کے متعلق مراسلے شائع ہوتے رہتے ہیں اور ہم کو
...فیت ملی ہے کہ کئی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں عرصہ دراز سے اردو اساتذہ کی جگہیں خالی ہیں،
...کرنے کے لئے پس ماندہ طبقے کا آدمی ڈھونڈا جا رہا ہے، جب آزادی کے بعد ہی سے
...ح پر اردو پڑھانے میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالی جا رہی ہیں، اردو کا رشتہ روزی روٹی سے
...ا گیا ہے اور غیر مسلموں نے اسے پڑھنا بالکل ترک کر دیا ہے اور وہ سبزۂ بیگانہ بنا دی گئی ہے تو
...سٹ سے تعلق رکھنے والا اردو خواں آسمان کی بدلیوں سے نہیں اترے گا، حکومت کی نیت ٹھیک
...ضامین کے استاذوں کے تقرر میں شیڈول کاسٹ کی شرط ختم کر کے اور جلد سے جلد ان کی خالی
...رے تاکہ اردو پڑھنے کے خواہش مند طلبہ کا نقصان نہ ہو۔

مقالات

تجرباتی علوم اور قرآن کا نظریۂ علم

وحی اور علم میں مطابقت کا ایک حیرت انگیز نظارہ

از مولانا محمد شہاب الدین ندوی ٭

وحی الٰہی کے اثبات کے لئے انبیائے کرام کو حسی معجزات اس لئے عطا کئے گئے تھے تاکہ لوگ ان کو دیکھ کر وحی الٰہی پر ایمان لا سکیں لیکن عصر حاضر اور موجودہ تجرباتی علوم کے دور میں وحی الٰہی کے اثبات کے لئے قرآن حکیم کے روپ میں ایک ایسا زندہ اور لازوال علمی معجزہ عطا کیا گیا جس کا معجزہ ہونا حیرت انگیز طور پر خود عصر جدید کی تحقیقات و تجربات کے ذریعہ اس طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ نوع انسانی کو انکار کی مجال نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ خدائی منصوبے کے مطابق کلام الٰہی کو کائنات کے ایسے اسرار سربستہ کا امین بنایا گیا جن کی سچائی و صداقت آگے چل کر خود انسانی تحقیقات و تجربات آشکارا کر دیں اور اس کے کلام الٰہی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہ جائے۔ یہ گویا کہ وحی الہام کے برحق ہونے پر ایک سائنٹفک ثبوت ہے، تاکہ اس مظاہرہ کے ذریعہ وحی اور علم یا ایمان اور عقل میں مطابقت ظاہر ہو جائے اور طبیعیات کا تعلق مابعد الطبیعیات سے کھل کر سامنے آ جائے۔ پھر اس کے نتیجے میں تشکیک (اسکیپٹیسزم) لا ادریت (اگناسٹیزم) اور منطقی اثباتیت (لاجیکل پازیٹیوازم) وغیرہ تمام گمراہ کن فلسفوں کا رد و ابطال بھی ہو جائے۔

٭ فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، دسواں مین، بی ٹی ایم لے آؤٹ، بنگلور ۲۹

لم حواس کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے؟ غرض اس مظاہرۂ الٰہی کے نتیجے میں جہاں
طرف ان تمام قدیم فلاسفہ کا بھی رد ہو جائے جو تجرباتی علم یا استقرائی منطق کو قابل استدلال
مانتے تھے تو دوسری طرف جدید فلاسفہ کا بھی رد ہو جائے جو وحی والہام کو بے بنیاد بتلاتے
صرف تجرباتی علم یا سائنسی بحث و تحقیق کے طور پر ثابت شدہ حقائق ہی کو حجت مانتے ہیں۔
اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اکثر قدیم فلاسفہ حواس کے ذریعہ حاصل ہونے والے علم ک
ہیں۔ چنانچہ فلسفۂ تصوریت کی بنیاد ہی یہی ہے کہ ہمیں حواس کے ذریعہ علم حاصل ہوتا ہے، وہ
وکا اور فریب ہے۔ افلاطون کا بھی یہی نظریہ تھا کہ محسوسات کی دنیا ایک دھوکا اور نمائش ہے۔
کے نظریئے کے مطابق محسوسات کا وجود حقیقی ہے۔ اور اس مسئلے میں قرآن حکیم بھی اسی کا مدعی
کسی پر بھی حجت ثابت نہیں ہو سکتی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم عالم ظواہر کو بطور حجت
ہے اور اس سلسلے میں بیسیوں آیات موجود ہیں جو اشیائے عالم میں غور و خوض کرنے پر
تی ہیں۔ مگر اس موقع پر صرف ایک آیت پیش کی جاتی ہے۔ جس کے مطابق اصولی طور پر
ہوتا ہے کہ قرآن کی نظر میں علم کا ایک ماخذ حواس (خصوصاً سمع و بصر) بھی ہے تو اس کا
عقل (فواد) ہے۔

السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ	سمع و بصر اور فواد (دل یا عقل) ہر ایک
لٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۔	سے یقیناً باز پرس ہوگی۔

(اسراء: ۳۶)

ن دو ذرائع سے استدلالی علم حاصل ہو سکتا ہے جس کے ذریعہ دوسروں پر حجت قائم
ہے۔ غرض عالم محسوسات دھوکہ نہیں بلکہ علم الاشیاء کی بنیاد و اساس ہے اور یہی
حضرت آدم علیہ السلام کو خلافت ارض اور تسخیر اشیاء کی غرض سے عنایت کیا گیا تھا۔ ان

آیت کریمہ پر تفصیلی بحث آگے آرہی ہے۔

تجربیت میں ارسطو اور جدید سائنس کا فرق ارسطو اگرچہ تجربیت کا داعی تھا یعنی وہ یہ نظریہ رکھتا تھا کہ اشیاء کا علم محسوسات کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ مگر وہ خود اس پر عمل نہ کر سکا اور نہ یونانی فلسفے میں اس کی کوئی ترغیب ہی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک مغربی مصنف ایڈون اے برٹ اپنی فاضلانہ کتاب "فلسفہ مذہب" میں تحریر کرتا ہے کہ ارسطو کی تجربیت اور جدید سائنسی تجربیت میں پانچ حیثیتوں سے فرق ہے۔ ان کی تحریر کا خلاصہ پیش ہے۔

پہلا فرق: انسان کے وقوفی اعمال کے مجموعی سیاق میں مدرکات سے صداقت حاصل کرنے کے تجربی عمل کے مقام کے تعین میں ارسطو اور جدید تجربیت پسندی میں بہت فرق ہے۔ ارسطو کے نزدیک یہ عمل عقلی تصدیق کی ایک ضروری اور ابتدائی منزل تھا یعنی اس طرح سے حاصل شدہ علم کی مدد سے منطقی استخراج کے ذریعہ جو حقائق مستنبط ہوتے ہیں ان کو ثابت کیا جا سکے ارسطو کے نزدیک صحیح سائنس کا مقام یہ تھا کہ معلومہ اصولوں سے دیگر قضایا کا باقاعدہ استخراج کیا جائے۔ اشیاء کے ادراک سے ان کی صورت کی وجدانی تفہیم تک پہنچنا سائنس کی ایک ضروری اور ابتدائی منزل ضرور تھی، لیکن وہ سائنس کا حصہ نہیں کہلا سکتی۔

دوسرا فرق: اس علمی ماحول کے زیر اثر ارسطو اور اس کے متبعین نے کبھی اس ضرورت کو محسوس نہ کیا کہ وہ تجربی انکشافات کے عمل کی رہنمائی کے لئے کوئی مفصل تحفظات ضبط تحریر میں لائیں۔ ان کا خیال تھا کہ ادراک، حافظہ اور عقلی تفہیم کے اعمال خود بخود اس قسم کی رہنمائی کا کام سرانجام دے سکتے ہیں اور اس کے لئے کسی قانون یا ضابطہ بندی کی ضرورت نہیں قدرتی واقعات کے مشاہدات کے علاوہ انہوں نے تجربات کی اہمیت کا کبھی احساس نہیں کیا۔ ان کے ذہن میں یہ خیال بھی کبھی نہ آیا کہ معلومہ اصولوں سے مستنبط شدہ نتائج کی صداقت

ہدات کی کسوٹی پر پرکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ میں تصدیق
(VERIFICATI) سائنسی عمل کا جزو نہیں۔

تیسرا فرق : ارسطو کے متبعین نے (سوائے چند معمولی مستثنیات کے) کبھی
نہیں کیا کہ تجرباتی انکشاف کے نتائج کے صدق (و کذب) کا انحصار معلوم مفروضات
ت، میسر سائنسی آلات اور تشریح و تاویل کے مروجہ تصورات پر ہوتا ہے۔ اگر کوئی اصول
ور پر سمجھ میں آجاتا تو اس کو مطلقاً صحیح تصور کر لیا جاتا۔ اس میں آئندہ درستی یا اصلاح کے
و تسلیم کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہ کی جاتی۔ عقلی شعور کے عمل کی صداقت گویا مسلم
ں کا یہ مطلب نہیں کہ ان لوگوں کے نزدیک مفکرین غلطی سے مبرا تھے۔ لیکن اس کا یہ
ضرور ہے کہ ان کی نگاہ میں عقل کی صلاحیت بہت زیادہ تھی اور اس کی کوتاہیوں
یوں سے اتنے واقف نہیں تھے جتنے کہ جدید سائنس داں۔ ان کے نزدیک ان غلطیوں
ام تھا جو ہمارے ہاں ریاضیاتی غلطی کی حیثیت ہوتی ہے۔

وتھا فرق : ارسطا طالیسی تجربیت چند مفروضات پر مبنی تھی۔ ان مفروضات کو
ے بغیر اس تجربیت کے مذکورہ بالا نقائص قائم رہنے ضروری تھے .... اس
ظریئے نے مذکورہ بالا مفروضات کو تسلیم کرنے میں مدد دی کہ علم میں اصلاح و ترمیم
نہیں اور تجرباتی انکشافات کی صحیح رہنمائی کے لئے کسی قسم کے تحفظات یا پابندی
ضرورت نہیں۔

نچواں فرق : اصلاح و ترمیم کی گنجائش سے انکار کرنے کا ایک اور نتیجہ برآمد
جربیت اس واقعے کو تسلیم کرتی ہے کہ قوانین فطرت جو ثابت کئے جا چکے ہیں یا
یافت ہوں گے، ایسے ہیں کہ ان کی بنا پر مستقبل کے واقعات کی پیش گوئی کی جا سکتی

اور ان کی مدد سے آئندہ پیش آنے والے واقعات پر کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ارسطا طالیسی
تجربیت اس قسم کی پیش گوئی اور واقعات کی ضابطہ بندی اور کنٹرول کے تصورات سے بالکل
ناآشنا تھی۔ درحقیقت یونانی ذہن تسخیر کائنات کے تصور سے بالکل ناآشنا تھا اور اس لئے
ان کے ہاں عقلیت کے نصب العین میں یہ چیز شامل نہ تھی۔ زمانہ وسطیٰ میں اس طرح کے
دنیوی مشاغل پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ مشاغل اخروی سعادت
کے حصول میں سدراہ بنتے ہیں[1]۔

جدید فلسفوں کا ابطال

لہٰذا اسلام نے قرآن حکیم کے ذریعہ تاریخ عالم میں پہلی بار تجربیت
کی صدا بلند کی، یعنی تجرباتی سائنس کو فروغ دینے پر زور دیا، جسے یونانیوں نے پوری طرح نظرانداز
کر دیا تھا تاکہ اس کے ذریعہ نہ صرف قدیم فلاسفہ بلکہ جدید فلاسفہ کا بھی رد و ابطال ہو جائے۔
قرآن حکیم کے ذریعہ وہ حقائق منظر عام پر آجائیں جن کی پیش خبری کلام الٰہی میں بے شمار آفاقی صداقتوں
کے روپ میں پہلے ہی سے درج کر دی گئی ہے تاکہ ان کے ذریعہ "قرآنی نظریہ علم" کا اثبات ہوا اور
اس کے مقابلے میں دیگر تمام غلط اور بے بنیاد نظریہ ہائے علم کا رد ہوا اور پھر اس کے نتیجے میں
ہر قسم کی بے مہار "عقلیت" کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔ چنانچہ عصر جدید میں جن مادی
فلسفوں نے نوع انسانی کو مختلف قسم کے فتنوں میں مبتلا کر رکھا ہے ان میں سے بعض یہ ہیں:
مادیت (میٹیریلزم)، عقل پرستی (انٹلکچولزم)، عقلیت (ریشنلزم)، مذہب سائنس (سائنٹزم)، ایجابیت
(پازیٹیوازم) اور منطقی اثباتیت (لاجیکل پازیٹیوازم) وغیرہ۔

قرآن تجرباتی سائنس کا داعی

غرض تجربیت یا تجرباتی سائنس کی بنیاد اسلام ہی کی ڈالی
ہوئی ہے تاکہ اس کے ذریعہ طبیعیات اور مابعد الطبیعیات میں ربط و تعلق ثابت ہو سکے اور
اس مظاہرہ کے ذریعہ وہ جدید ترین انتہا پسندانہ فلسفوں کا بھی خاطر خواہ رد و ابطال کر کے

روحانی اقدار کا احیاء کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم کے ذریعہ تجرباتی سائنس کے فروغ پر زور دیا گیا، جیسا کہ اس سلسلے میں بے شمار قرآنی آیات موجود ہیں۔ بطور مثال اس موقع پر چند آیات پیش کی جاتی ہیں:

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (یونس: ۱۰۱)

کہہ دو کہ ذرا غور سے دیکھو تو سہی زمین اور آسمانوں میں کیا کیا چیزیں موجود ہیں؟

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (آل عمران: ۱۹۰)

زمین اور آسمانوں کی خلقت و ہیئت اور دن رات کے ہیر پھیر میں دانش مندوں کے لئے یقیناً بہت سی نشانیاں موجود ہیں

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ وَفِیْ خَلْقِكُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (جاثیہ: ۳-۴)

زمین اور آسمانوں میں ایمان والوں کے لئے یقیناً بہت سی نشانیاں (دلائل ربوبیت) موجود ہیں۔

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ وَفِیْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔ (ذاریات: ۲۰-۲۱)

یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں بہت سی نشانیاں موجود ہیں اور خود تمہاری ہستیوں میں بھی، کیا تم کو نظر نہیں آتا؟

اَوَلَمْ یَرَوْا كَیْفَ یُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ (عنکبوت: ۲۰)

کیا انہوں نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ کس طرح (ہر) مخلوق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہے؟ یقیناً یہ فعل اللہ

کے لئے بہت آسان ہے۔

قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ یُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (عنکبوت: ۲۱)

کہہ دو کہ زمین میں چل پھر کر جائزہ لو کہ اس نے مخلوق کو (پہلی دفعہ) کس طرح پیدا کیا؛ پھر اللہ اسی طرح آخرت میں دوبارہ پیدا کرے گا۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ (انعام: ۱۰)

کہہ دو کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ اللہ کی تکذیب کرنے والوں کا انجام کیا ہوا؟

اَفَلَمْ یَنْظُرُوْا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَیْفَ بَنَیْنٰهَا وَزَیَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِیْجٍ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰی لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ۔ (ق: ۶-۸)

کیا انہوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے کس طرح بنایا اور اسے زینت بخشی اور اس میں کوئی رخنہ (کسی طرح کا خلل) موجود نہیں ہے۔ اسی طرح ہم نے زمین کو (اس کی پوری گولائی میں) پھیلایا اور اس میں مضبوط پہاڑ ڈال دیے اور اس میں ہر قسم کے زوج (نر و مادہ پھول) اگا دیے۔ یہ سب کچھ (اللہ کی طرف) رجوع کرنے والے ہر بندے کے لئے بطور بصیرت اور یاد دہانی ہے۔

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (فاطر: ۲۸) — اللہ سے اس کے بندوں میں صرف اہل علم ہی ڈر سکتے ہیں۔

فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ (حشر: ۲) — اے آنکھوں والو عبرت حاصل کرو۔

قرآن مجید میں اس قسم کی بے شمار آیات موجود ہیں جو انسان کو علم، عقل اور تفکر و تدبر کے ریعہ اشیائے عالم کے مشاہدے اور باریک بینی کے ساتھ ان کا جائزہ لینے پر ابھارتی ہیں۔ ب کہ دوسری طرف کلام الٰہی میں علم و عقل اور غور و فکر سے کام نہ لینے والوں اور خدا کی نشانیوں نکار کرنے والوں کی مذمت کرتے ہوئے انہیں گونگے بہرے اور بدترین چوپاؤں سے تشبیہ گئی ہے:

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ (انفال: ۲۲) — اللہ کے نزدیک بدترین چوپائے وہ بہرے اور گونگے لوگ ہیں جو کچھ بھی نہیں سمجھتے۔

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا صُمٌّ وَبُكْمٌ فِي الظُّلُمَاتِ (انعام: ۳۹) — اور جن لوگوں نے ہماری نشانیوں (دلائل ربوبیت) کو جھٹلایا وہ بہرے اور گونگے ہیں جو تاریکیوں میں ہیں۔

غرض قرآن حکیم آفاق و انفس کی چھان بین کے ذریعہ اس کائنات کی تمام اشیاء کا مطالعہ ور ان کے سینوں میں ودیعت شدہ عبرتوں اور بصیرتوں سے سبق حاصل کرنے کی دعوت عام اور جو لوگ ان اسباق و بصائر سے روگردانی کرتے ہوئے اپنے رویہ کو کسی بھی طرح تیار نہ ہوں انہیں بہائم اور چوپائے قرار دیتا ہے جو کچھ بھی سننے اور سمجھنے پر تیار نہ ہوں بڑھ کر اسلام کی معقولیت اور کیا ہو سکتی ہے جو اس کائنات کو ایک کھلی کتاب قرار دے کر

کھلے دل و دماغ کے ساتھ اس کا مطالعہ کرنے کی دعوت دیتا ہے؛ لہٰذا اسلام پر بے عقلی یا جمود پسندی کا الزام کسی بھی طرح عائد نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ دعوت فکر وہی دے سکتا ہے جو مظاہر کائنات اور ان کی اندرونی مشنری سے پوری طرح واقف ہو اور جسے اپنے کلام کے غلط ہو جانے کا کسی بھی طرح خدشہ نہ ہو۔

جدید فلسفے پر ایک نظر

بہر حال قرآنی نظریہ علم اور اس کے تصورات علم پر بحث کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتا دیا جائے کہ خود نظریہ علم سے مقصود کیا ہے؛ اور فلسفے سے اس کا کیا تعلق ہے؟

فلسفے کی کوئی جامع و مانع تعریف موجود نہیں ہے۔ بلکہ ہر فلسفی نے اپنے اپنے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے اس کی مختلف تعریف کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مظاہر و ظواہر سے پُر یہ کائنات ایک بھول بھلیوں کی طرح ہے، لہٰذا ایک فلسفی کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ مادی اشیاء کی حقیقت و ماہیت اور ان کے پس پردہ کارفرما کسی ہستی کے وجود کا پتہ چلائے جسے علت تکوین یا علت العلل کہا جا سکے۔ اس اعتبار سے افلاطون اور ارسطو سے لے کر بیکن، ڈیکارٹ، کانٹ اور ہنری برگسان وغیرہ تمام قدیم و جدید فلاسفہ کی تگ و تاز کا محور یہی رہا ہے۔

اس موقع پر فلسفے پر کوئی مبسوط بحث کرنا مقصود نہیں بلکہ یہ بتانا ہے کہ قدیم و جدید فلسفے کے مباحث میں کافی فرق ہے۔ جدید فلسفے کی حسب ذیل تین اہم شاخیں قرار دی گئی ہیں جو یہ ہیں۔

۱۔ وجودیات یا وجود کی بحث (اونٹولوجی) اس کو مابعد الطبیعیات (میٹافزکس) بھی کہا جاتا ہے۔
۲۔ نظریۂ علم (ایپسٹمولوجی)
۳۔ اقدار (ویلیوں) کی بحث۔

وجودیات یا مابعد الطبیعیات میں حقیقت مطلقہ یا وجود حقیقی سے بحث کی جاتی ہے۔ یعنی اس

ات کی آخری صداقت کیا ہے ؟ آیا ایسا کوئی وجود ہے جو ظواہر اشیاء کی ضد ہے ؟ نظریہ علم
مراد یہ ہے کہ علم کی اصل ماہیت کیا ہے ؟ اور کیا حقیقت کا علم ممکن ہو سکتا ہے ؟ نیز یہ کہ
ے حدود وضوابط کیا ہیں اور اس کے ذرائع کیا ہیں ؟ موجودہ دور میں اس بحث نے کافی اہمیت
یار کر لی ہے اور فلسفہ اقدار میں اخلاق، منطق اور جمالیات سے بحث کی جاتی ہے۔ اخلاقیات
یر و شر اور خوب و ناخوب وغیرہ زیر بحث آتے ہیں جن کا تعلق انسانی کردار و کیرکٹر سے ہے۔

یہ علم پر ایک نظر | اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عصر جدید میں نظریہ علم نے جو کروٹ
ہے اس پر قدرے تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی جائے، جس نے مادیت کا جامہ زیب تن
تمام دینی و روحانی اقدار کا انکار کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس کی نظر میں وحی والہام اور تمام
ی صداقتیں دقیانوسیت کی نشانی بن کر رہ گئی ہیں۔

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے نظریہ علم ایک فلسفیانہ اصطلاح ہے، جس کو تھیوری آف نالج
جاتا ہے اور یہ بطور اصطلاح انیسویں صدی عیسوی میں مشہور ہوئی [۱۲] نظریہ علم کی مختصر
اس طرح ہے: فطرت کا مطالعہ اور انسانی علم کا جواز۔

The study of nature and validity of human knowled

اس نظریہ علم کے مطابق ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم فطرت کا علم کس طرح
کر سکتے ہیں؟ اور اس کے حدود و ضوابط کیا ہیں؟ قدیم یونانی فلاسفہ نے علم، صداقت
یں ے کے باہمی تعلقات کی جانچ پڑتال کی تھی۔ نیز انہوں نے یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ
جاننے والے کے لئے آزادانہ طور پر پایا جاتا ہے؟ تاہم لاک اور کانٹ نے پہلی بار نظریۂ
مام فلسفیانہ اور سائنسی تحقیق کے لئے بنیادی قرار دے دیا [۱۳]

اس نظریہ کے فروغ کا نتیجہ یہ ہوا کہ آگے چل کر عقلیت (ریشنلزم) اور تجربیت

(ایمپیریسیزم) نے خوب زور پکڑ لیا۔ چنانچہ ہیوم کے نزدیک نا قابل ادراک شے کی قبولیت
کے لئے شہادت ضروری ہے۔ لہٰذا وہ ہر عقیدے پر یقین کے لئے شہادت کا مطالبہ کرتا ہے[۵]۔
اسی طرح ہربرٹ اسپنسر مابعد الطبیعی حقائق کا قائل تو تھا مگر وہ روایتی نظریات کی شہادت
کو ناکافی تصور کرتا تھا[۶] اور کانٹ کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ مابعد الطبیعی امور انسانی
گرفت میں نہیں آسکتے[۷] اس اعتبار سے مذہب اور سائنس کے درمیان اصل تنازعہ ادراک
بالحواس کا ہے۔

الغرض اس بحث سے واضح ہو گیا کہ فلسفے کا اصل مقصود حقیقت مطلقہ کا علم حاصل
کرنا ہے۔ مگر چونکہ جدید فلسفہ روایتی اقدار و عقائد کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہوئے ان کے
حجت ہونے پر سوالیہ نشان لگاتا ہے اور تجربیت پر زور دیتے ہوئے صرف حواس کے ذریعہ
حاصل ہونے والے علم ہی کو قابل استدلال مانتا ہے۔ اس لئے جدید فلسفے میں "نظریہ علم" نے
ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہے۔

عصر جدید میں فرانسس بیکن نے (۱۶۰۰ء کے لگ بھگ) یورپ میں پہلی بار ارسطو کے
قیاسی فلسفے سے اختلاف کرتے ہوئے استقرائی فلسفے پر زور دیا تھا جس کی بنیاد مشاہدے
اور تجربے پر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آگے چل کر جدید فلاسفہ نے تجربیت کو پوری طرح اپناتے
ہوئے روایتی علوم یا دینیات کا انکار کر دیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ علوم تجربات کے دائرے
میں نہیں آتے، افلاطون، ارسطو، بیکن اور ڈیکارٹ کے نزدیک مابعد الطبیعیات فلسفے
کا ایک اہم جز رہا ہے، جب کہ بعض جدید ترین فلسفے جیسے مذہب سائنس (سائنٹزم) اور منطقی
اثباتیت (لوجیکل پازیٹیوازم) وغیرہ کے نزدیک طبیعیات یا دنیائے مادی کے ماوراء کوئی
فوق الطبیعی (سوپر نیچرل) ہستی موجود نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کے فلسفوں کا دعویٰ ہے کہ جو چیز

ں یا محسوسات کے دائرے سے باہر ہو اس کا کوئی وجود نہیں ہو سکتا۔ اس طرح انہوں نے
ا لطبیعیات کے خلاف ایک جنگ چھیڑ رکھی ہے اور مادی فلسفے وحی والہام کو علم کا
ہ نہیں مانتے۔ بلکہ صرف محسوسات کے ذریعہ حاصل ہونے والے علم ہی کو مستند قرار
ہوئے روایتی عقائد و اقدار کو تجربی علوم کی روشنی میں جانچنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

عصر جدید میں سائنس اور فلسفہ دونوں کا مقصد اشیاء کی تہہ تک پہنچ کر صداقت
قت مطلقہ کی تلاش کرنا ہے۔ مگر ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ سائنس اشیاء کا
ینی کے ساتھ مطالعہ کر کے قریبی علتیں دریافت کرتی ہے جب کہ فلسفہ سائنسی تحقیقات
فات کو بنیاد بنا کر بعید ترین علتوں کی تلاش کرتا ہے۔ اس اعتبار سے فلسفے کا ارتقار
ں ارتقار کے تابع ہوتا ہے۔ چنانچہ جب کبھی سائنس کوئی نئی حقیقت دریافت کرتی
سفے کو بھی اپنے نظریات میں ترمیم کرنی پڑتی ہے۔ اس لحاظ سے سائنس اور فلسفے میں
میل قائم رہنا بہت ضروری ہے ورنہ کوئی بھی فلسفہ از کار رفتہ بن کر رہ جائے گا۔

دور قدیم میں سائنس اور فلسفے کے مباحث باہم ملے ہوئے تھے۔ یعنی اس وقت فلسفہ
ئنس بھی داخل تھی، اگرچہ وہ ابتدائی حالت میں تھی۔ مگر دور جدید میں یہ دونوں الگ
لوم قرار پاگئے۔ جو مباحث تجربات کے دائرے میں آتے ہوں ان کو سائنس قرار دیا
و مباحث تجربات کے دائرے میں نہ آتے ہوں انہیں فلسفہ کہا گیا۔

ظیم کا نیا معجزہ | اس پس منظر میں قرآنی نظریہ علم اور اس کے تصورات علم کو
سان ہو جاتا ہے کہ اشیاء کے خارجی وجود کے بارے میں اس کا کیا نظریہ ہے؟
ت و معقولات کے ذریعہ ان کا علم کس حد تک حاصل ہو سکتا ہے؟ اور یہ کہ کیا
اپنے مشاہداتی و تجرباتی علم کی رو سے حقیقت حال تک پہنچ سکتا ہے؟ اس بحث

سے نہ صرف یہ کہ قدیم و جدید ہر قسم کے بے بنیاد فلسفوں اور نظریوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے بلکہ جدید
مادہ پرست فلاسفہ کے مطالبے کے مطابق مابعد الطبیعی حقائق کے وجود پر سائنٹفک ثبوت
بھی مہیا ہو جاتا ہے، جو تاریخ فلسفہ میں ایک بالکل انوکھی اور نرالی چیز ہے۔ ایک ایسا ثبوت
جس کا انکار مادہ پرست کسی بھی طرح نہیں کر سکتے۔ یہ عصر جدید پر اتمام حجت کے لئے قرآن عظیم کا
ایک نیا اور تازہ معجزہ ہے جو سلیم الفطرت انسانوں کی رہنمائی کے لئے بہت کافی ہے۔ اس بحث
سے یہ حقیقت بھی بخوبی واضح ہو جائے گی کہ قرآن عظیم ہر دور کے تقاضوں کے مطابق نوع انسانی
کی ہدایت و رہنمائی کا فریضہ بخوبی انجام دے سکتا ہے اور اس اعتبار سے وہ ہمیشہ تازہ اور
سدا بہار رہے گا۔ اس پر کہنگی کی پرچھائیاں کبھی نہیں پڑ سکتیں۔ کیونکہ وہ رب العالمین کا کلام
اور اس کے علم ازلی کا پرتو ہے۔ جو اس عالم آب و خاک کی ایک ایک چیز اور اس کے ایک ایک
بھید سے بخوبی واقف ہے۔ لہذا اس نے اپنے کلام حکمت میں ہر قسم کے "ذہنی امراض" سے نپٹنے
کا سامان بطور پیش بندی پہلے ہی سے مہیا کر رکھا ہے۔ اس اعتبار سے کلام الہی کے علمی اعجاز پر
ایک نئی روشنی پڑتی ہے، جو عالم انسانی کی عبرت و بصیرت کے لئے بہت کافی ہے۔

قرآن کا فلسفۂ کائنات | اس سلسلے میں سب سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم نے نوع
انسانی کو غور و فکر اور تعقل و تدبر کے ذریعہ زمین و آسمان کی تمام اشیاء و موجودات کا نہایت
درجہ باریک بینی کے ساتھ جائزہ لینے اور مشاہدے و تجربے کے ذریعہ ان میں ودیعت شدہ
خدائی اسباق و بصائر کو پوری ایمانداری کے ساتھ روشن اور نمایاں کرنے کا حکم دیا ہے۔
چنانچہ اس سلسلے میں بعض آیات پچھلے صفحات میں پیش کی جا چکی ہیں اور کچھ مزید آیات حسب ذیل ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ — اور اس کی نشانیوں میں سے ہے زمین
وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ — اور اجرام سماوی کو پیدا کرنا اور تمہاری

وَاَلْسِنَتِكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ۔ (روم : ۲۲)

زبانوں اور رنگتوں میں اختلاف رکھنا یقیناً اس باب میں اہل علم کے لئے (وجود باری کی) نشانیاں موجود ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا، اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (روم : ۲۴)

اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ تمہیں بجلی خوف اور امید کے طور پر دکھاتا ہے اور اوپر سے بارش برسا کر زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد (دوبارہ) زندہ کردیتا ہے۔ اس مظہر (خداوندی) میں یقیناً عقل والوں کے لئے (وجود باری) نشانیاں موجود ہیں۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (روم : ۳۷)

کیا انہوں نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ جس کے لئے چاہتا ہے رزق کشادہ اور (جس کے لئے چاہے) تنگ کردیتا ہے۔ یقیناً اس باب میں ایمان لانے والوں کے لئے نشانات باری موجود ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ۔ (حم سجدہ : ۳۷)

رات اور دن اور آفتاب و ماہتاب (حیرت انگیز نظاموں کی بدولت) اس کی نشانیوں میں سے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ

اس کے وجود کی نشانیوں میں سے ہے

وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ (شوریٰ : ۲۹)

اجرام سماوی اور زمین کو پیدا کرنا اور ان دونوں میں جانداروں کو پھیلا دینا وہ (ان دونوں سلسلے کی) عاقل مخلوق کو جب چاہے (کسی ایک مقام پر) جمع کرنے پر قادر ہے۔

ان آیات میں خطاب اہل علم، اہل دانش اور ایمان لانے کی خواہش رکھنے والوں سے ہے۔ اس طرح قرآن حکیم لوگوں کے جذبات سے نہیں بلکہ ان کی عقل و بصیرت سے اپیل کرتا ہے اور ان کے دل و دماغ کو جھنجھوڑتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ پوری سنجیدگی اور معقولیت کے ساتھ ان مظاہر ربوبیت اور ان کے نظاموں میں تحقیق و تفتیش کریں۔ کیونکہ نقاش فطرت نے زمین و آسمان اور ان میں موجود اشیاء کے نظاموں کو بے کار و بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے بلکہ انہیں پوری حکمت اور منصوبہ بندی کے ساتھ وجود میں لایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا، ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (دخان : ۲۷)

ہم نے زمین و آسمان اور ان کے درمیان موجود چیزوں کو بے کار (بے مقصد) پیدا نہیں کیا۔ یہ تو منکرین خدا کی بدگمانی ہے

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (دخان : ۳۸ : ۳۹)

ہم نے زمین، اجرام سماوی اور ان کے درمیان موجود چیزوں کو کھیل کود میں پیدا نہیں کیا ہے۔ بلکہ ہم نے ان سب کو حقانیت (منصوبہ بندی) کے ساتھ وجود بخشا ہے۔ لیکن ان میں سے بہت سے

لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى۔
(احقاف: ۳)

ہم نے اجرام سماوی، زمین اور آسمان کے درمیان موجودات کو مصلحت کے ساتھ اور ایک وقت مقررہ تک کے لئے پیدا کیا ہے۔

چنانچہ اس خدائی مصلحت اور "اجل مسمّیٰ" کی تصدیق و تائید خود سائنسی تحقیقات کے ذریعہ بھی اچھی طرح واضح ہو رہی ہیں کہ اربوں کہکشاؤں اور کھربوں کھربوں ستاروں اور سیاروں کی یہ پوری کائنات مستقبل میں باہم ٹکرا کر ختم ہوجائے گی۔ نیز ایک ایسا وقت بھی ضرور آنے والا ہے جب کہ خود ہمارا سورج بھی اپنی روشنی اور توانائی کھو کر بالکل ٹھنڈا یا "مردہ" ہوجائے گا، اس دن یہ واقعہ ہمارے نظام شمسی کے لئے قیامت کا دن ہوگا [۵]

غرض صحیفۂ فطرت میں ودیعت شدہ اس قسم کی آفاقی نشانیوں کو نظر انداز کرکے آنکھیں موند لینا بڑی ہی محرومی اور بدقسمتی کی بات ہے۔ اس قسم کا رویہ فاسق و بدکردار لوگ ہی اختیار کر سکتے ہیں جو اپنے انجام سے غافل و بے خبر یا حقائق سے آنکھیں چرانے والے ہوں۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ
(یوسف: ۱۰۵)

زمین اور اجرام سماوی میں ایسی کتنی ہی نشانیاں (وجود باری کے دلائل) ہیں، جن پر سے یہ لوگ (منکرین حق، چشم پوشی کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ (حج: ۱۶)

اور اسی طرح ہم نے اس قرآن کو روشن دلائل کے ساتھ اتارا ہے اور اللہ اسی کو ہدایت دیتا ہے جو ہدایت کا ارادہ کرتا ہے۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ۔
(بقرہ: ۹۹)

یقیناً ہم نے آپ پر (اس قرآن کے ذریعہ) کھلے کھلے دلائل اتار دئے ہیں جن کا انکار بدکردار لوگ ہی کر سکتے ہیں

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ۔
(حج: ۴۶)

کیا انہوں نے زمین کی سیر نہیں کی، تاکہ ان کے ایسے دل ہوتے جن کے ذریعہ (زمین پر موجود مختلف احوال وکوائف کو) سمجھتے، یا ان کے ایسے کان ہوتے جن سے وہ (ان حقائق و واقعات کو) سنتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ سینوں کے اندر موجود دل اندھے ہوتے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہمیشہ اور ہر دور میں یہ رہی ہے کہ جب منکرین حق مسلسل و پیہم خدائی دلائل و براہین کو نظر انداز کرتے ہوئے خدائی ہدایت کو خاطر میں نہیں لاتے بلکہ اپنے علوم وفنون پر فخر کرتے ہوئے پیام الٰہی کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں تو ان پر حجت پوری ہوجاتی ہے۔ پھر اچانک انہیں عذاب الٰہی آلیتا ہے اور وہ کف افسوس مل کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت کی پشیمانی انہیں کچھ فائدہ نہیں دیتی۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ
فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ كَانُوا
أَكْثَرَ مِنْهُمْ وَأَشَدَّ قُوَّةً وَّ
آثَارًا فِي الْأَرْضِ فَمَا أَغْنَىٰ
عَنْهُم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ
فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم
بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِندَهُم
مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِم
مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ
فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا
بِاللَّهِ وَحْدَهُ وَكَفَرْنَا بِمَا
كُنَّا بِهِ مُشْرِكِينَ. فَلَمْ يَكُ
يَنفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا
بَأْسَنَا سُنَّتَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ
خَلَتْ فِي عِبَادِهِ وَخَسِرَ
هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ.

(مومن: ۸۲ - ۸۵)

کیا ان لوگوں نے زمین کی سیر نہیں کی تاکہ
وہ دیکھتے کہ ان سے پہلے لوگوں کا انجام
کیا ہوا؟ وہ لوگ ان سے زیادہ اور
شدید قوت والے تھے جو زمین میں اپنے
آثار و مظاہر چھوڑ گئے۔ لیکن ان کا کسب
ان کے کچھ بھی کام نہ آیا۔ چنانچہ ہمارے
رسول جب ان کے پاس کھلے ہوئے
دلائل لے کر آئے تو وہ اپنے علم و دانش
پر اترانے لگے اور جس چیز کا وہ استہزاء
کرتے تھے اس نے انہیں آگھیرا۔ جب
انہوں نے ہمارے عذاب کو آتے دیکھا
تو (بے اختیار) کہہ اٹھے کہ ہم اللہ واحد
پر ایمان لائے اور ان سب چیزوں کا
انکار کیا جن کو ہم خدا کا شریک ٹھہراتے
تھے۔ مگر ہمارا عذاب دیکھ لینے کے بعد
ان کا ایمان لانا انہیں کوئی فائدہ نہیں
پہنچا سکا۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو اس کے
بندوں میں گزر چکی ہے۔ غرض اس وقت
منکرین خدا گھاٹے میں رہ گئے۔

یہ قرآن حکیم کے "فلسفہ کائنات" پر ایک اجمالی نظر تھی جس کے ملاحظے سے قرآنی دلائل و براہین کا ایک پورا فلسفہ ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ اس کتاب حکمت میں مابعد الطبیعی حقائق اور وحی و الہام کے اثبات کے لیے "طبیعی دلائل" یا وجود باری کی نشانیوں کا ایک مکمل نظام موجود ہے جو ہر دور کے تقاضوں کے مطابق نوع انسانی کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ اس لحاظ سے اس میں عصر جدید کی بھی مکمل رہنمائی کا سامان موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنا جامع اور مکمل نظام دلائل جو ہر دور کے تقاضوں کے عین مطابق ہو وہ کسی انسان کا وضع کیا ہوا نہیں ہو سکتا، لہذا ہم محض اس جامع نظام دلائل کو دیکھ کر ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ کلام ایک مافوق الطبیعی ہستی کا ہو سکتا ہے، جو انسان نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ اس کے تفصیلی دلائل کے مطالعے سے مادیت کے سارے تار و پود بکھر جاتے ہیں جو اس کی ایک دکھتی رگ پر انگلی رکھتے ہوئے اس کے تمام امراض کی صحیح صحیح تشخیص کرتا اور ہر دوراہے پر میل کے پتھر نصب کر کے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس سے بڑھ کر قرآن عظیم کا علمی معجزہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ چنانچہ آپ اس کتاب حکمت کو کسی بھی حیثیت سے جانچیے وہ ہر اعتبار سے مکمل اور بے عیب دکھائی دے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ خصوصیت سوائے کلام الہی کے کسی انسانی کلام میں پائی نہیں جا سکتی کہ زمانہ جیسے جیسے ترقی کرتا جا رہا ہے ویسے ویسے صحیفہ الہی کے اسرار و عجائب کھلتے جا رہے ہیں اور اس کے معانی و مطالب نکھر نکھر کر سامنے آ رہے ہیں اور وہ از کار رفتہ ہونے کے بجائے ہر دم تازہ اور اپٹوڈیٹ نظر آ رہا ہے۔ قرآن عظیم کے کلام الہی ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا چاہیے۔

سائنس اور فلسفہ قرآن کی نظر میں

اوپر مذکورہ تمام آیات کے ملاحظے سے یہ بے غبار حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ مظاہر عالم کی چھان بین اور ان کی تحقیق و تفتیش سے جو تکوینی یا طبیعی علم حاصل ہوتا ہے اس کے ذریعہ خدائی حجت پوری ہو جاتی ہے۔ لہذا قرآن حکیم کے ذریعہ اس طریقے کے مطابق حصول علم پر زور دیا گیا اور اس طبیعی علم کو دین کی نظر میں قابل استدلال قرار دیا گیا ہے۔

اس علم کی پہلی منزل "نظر" ہے، جس میں بصارت و بصیرت کے ساتھ دیکھنے کے علاوہ غور و فکر کرنے اور کسی چیز کا جائزہ لینے کے معنی بھی ہیں۔ نیز اس کے معنی کسی چیز کے جائزے سے حاصل ہونے والے نتیجۂ فکر کے بھی ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں علامہ راغب اصفہانی تحریر کرتے ہیں:

"النظر تقليب البصر والبصيرة لادراك الشئ ورويته وقد يراد به التامل والتفحص۔ وقد يراد به المعرفة الحاصلة بعد الفحص وقوله (قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ) اى تاملوا"

اس اعتبار سے یہ ایک جامع لفظ ہے جس کے مفہوم میں کسی چیز کا بغور مشاہدہ کرنا اور غور و فکر کے ذریعہ اس کی چھان بین کرنا ہے۔ چنانچہ کلام الٰہی میں متعدد مقامات پر یہ لفظ منکرین پر بطور حجت لایا گیا ہے۔ مثلاً:

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا تُغْنِى الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ (یونس: ۱۰)	کہدو کہ ذرا غور سے دیکھو (جائزہ لو) تو سہی کہ زمین اور اجرام سماوی میں کیا کیا چیزیں موجود ہیں؟ (لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ) ایمان نہ لانے والوں کے لئے (وجود باری کی) یہ نشانیاں اور ڈراوے کچھ بھی فائدہ نہیں دیتے۔
اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِي مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ وَّاَنْ عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ (اعراف: ۱۸۵)	کیا انہوں نے زمین اور اجرام سماوی کی بادشاہت اور ان میں اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو بغور نہیں دیکھا (ان کا جائزہ نہیں لیا)؟ اس بنا پر ہو سکتا ہے کہ ان کا وقت قریب آچکا ہو۔ اس (حکیمانہ کلام) کے بعد وہ کس چیز پر ایمان لائیں گے؟

غرض ان آیات کی رو سے بخوبی ثابت ہو گیا کہ قرآن کی نظر میں زمین سے لے کر آسمان تک تمام مظاہر و موجودات قابل حجت و استدلال ہیں، جو "طبیعیات" یا نیچر کے دائرے میں آتے ہیں چنانچہ ان مظاہر و موجودات کا تفصیلی علم حواس خمسہ کے ذریعہ مشاہدے اور تجربے کی مدد سے حاصل ہوتا ہے۔ حواس خمسہ کے ذریعہ حاصل ہونے والی معلومات علم کی پہلی منزل ہے۔ جب کہ اس کی دوسری منزل تعقل و تفکر ہے یعنی مشاہداتی و تجرباتی حقائق کو ترتیب دے کر ان سے منطقی قضایا مرتب کرنا۔ بالفاظ دیگر استقرائی معلومات (سائنسی حقائق) کو مرتب کر کے ان سے دلیل و استدلال کے لئے کلیات وضع کرنا۔ اس اعتبار سے قرآن حکیم کی نظر میں سائنس اور فلسفہ (علم کلام) دونوں معتبر ہیں۔ مظاہر کائنات کی چھان بین اور ان کی تحقیق و تفتیش کرنا ماہرین طبیعیات یا سائنس دانوں کا کام ہے جب کہ سائنسی تحقیقات و اکتشافات کو بنیاد بنا کر ان سے کلی نتائج اخذ کرنا فلاسفہ یا متکلمین کی ذمہ داری ہے۔

غرض انہی علوم کے حاملین کو قرآن حکیم نے متعدد مواقع پر اہل دانش، مفکرین، عالم لوگ اور علماء وغیرہ کے خطاب سے نوازا ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر آفتاب و ماہتاب کی چند خصوصیات کا تذکرہ کرنے کے بعد ان کے نظاموں میں موجود حقائق کا پتہ چلانے والوں کو "علم والے" (لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ) قرار دیا گیا ہے:

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ	وہی ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں

مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ
وَالْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ
[...]لَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ
[...]يَعْلَمُوْنَ۔ (یونس: ۵)

تاکہ تم برسوں کی تعداد اور حساب معلوم
کرسکو۔ یہ سب کچھ اللہ نے مصلحت کے
لئے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی آیتیں
علم والوں کے لئے کھول کھول کر بیان
کرتا ہے۔

[...]ک اور موقع پر نباتات میں پائے جانے والے غلوں اور پھلوں کے اختلاف ذائقہ کی
[...]ی توجہ مبذول کراتے ہوئے اس عجیب و غریب منظر ربوبیت میں غور و خوض کرنے
[...] عقل والوں" کے خطاب سے نوازا ہے۔

[...]ی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ
[...]نّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ
[...]نَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ
[...]بِمَاءٍ وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ بَعْضَهَا
[...]بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ اِنَّ فِيْ
[...] لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ
(رعد: ۴)

زمین میں کچھ خطے پاس پاس واقع ہیں،
اور انگور کے باغات اور کھیتی اور شاخوں دار
و غیر شاخوں دار کھجور کے درخت بھی موجود
ہیں ان سب کو ایک ہی پانی سے سینچا
جاتا ہے، لیکن ہم ذائقے میں ان میں سے
ایک کو دوسرے پر بڑھا دیتے ہیں (یعنی
ان کے ذائقے مختلف بناتے ہیں) یقیناً
اس (منظر ربوبیت) میں عقل مندوں
کے لئے بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔

[...]ح ایک جگہ شہد اور اس کی مکھیوں کے محیر العقول کارنامے کا ذکر کرتے ہوئے
[...]غور و فکر کرنے پر اس طرح ابھارا گیا ہے:

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ
اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ
بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا
يَعْرِشُوْنَ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ
الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ
رَبِّكِ ذُلُلًا يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا
شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ
فِيْهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ
فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ
يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ (نحل: ۶۸-۶۹)

اور میرے رب نے شہد کی مکھی کو (الہام
کے ذریعہ) آگاہ کیا کہ تو اپنے گھر بنا پہاڑوں
میں، درختوں میں اور لوگوں کی بنائی ہوئی
چھتوں میں۔ پھر ہر قسم کے پھولوں کو
چوستی پھر اور اپنے پروردگار کی آسان
راہوں پر چلا کر۔ چنانچہ اس کے پیٹ سے
مختلف رنگوں والا ایک مشروب نکلتا
ہے جس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔
اس (منظر ربوبیت) میں غور و فکر
کرنے والوں کے لئے ایک نشانی موجود ہے۔

ایک اور موقع پر خدا کی خدائی میں دوسروں کو شریک کرنے والوں کی مثال (اپنی کمزوری میں) مکڑی کے جالے سے مشابہ قرار دیتے ہوئے ان کی مذمت کی گئی ہے۔ پھر اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ اس قسم کی مثالوں کو صرف "عالم لوگ" ہی سمجھ سکتے ہیں:

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ
الْعَنْكَبُوْتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا
وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ
الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ
...... وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ

ان لوگوں کی مثال جنھوں نے اللہ کے سوا
دوسروں کو کارساز بنایا ہے مکڑی جیسی ہے،
کہ وہ بھی (ایک طرح کا) گھر بناتی ہے۔
مگر بلاشبہ مکڑی کا گھر تمام گھروں میں
سب سے زیادہ بودا ہوتا ہے۔ کاش یہ
لوگ (اس حقیقت کو) سمجھ سکتے۔ یہ مثالیں

نَضۡرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعۡقِلُهَا	ہم لوگوں کے لئے بیان کر رہے ہیں مگر
اِلَّا الۡعَالِمُوۡنَ۔	ان مثالوں کو صرف عالم لوگ ہی سمجھ
(عنکبوت : ۴۱ - ۴۳)	سکتے ہیں۔

ایک اور جگہ ایک ہی پانی سے رنگ برنگے میوے نکالنے، نیز پہاڑوں، انسانوں اور چوپاؤں
بھی رنگوں کا اختلاف رکھے جانے کو وجود باری کی دلیل قرار دیتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ قدرت
بوبیت کے ان انوکھے نظاروں میں غور و فکر کرنے والوں میں اللہ کا ڈر پیدا ہو جاتا ہے،
طالعہ فطرت کا حاصل اور نتیجۃ النتائج ہے :

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنۡزَلَ مِنَ	اے مخاطب کیا تو نے مشاہدہ نہیں کیا
السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ	کہ اللہ نے بلندی سے پانی برسایا، پھر ہم نے
ثَمَرٰتٍ مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُهَا	اس پانی کے ذریعہ رنگ برنگے پھل
وَمِنَ الۡجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيۡضٌ وَّ	نکالے ؛ اسی طرح پہاڑوں میں کچھ مختلف
حُمۡرٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهَا وَغَرَابِيۡبُ	رنگوں کے سفید، سرخ اور بہت سیاہ
سُوۡدٌ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ	ہوتے ہیں نیز یہ کہ انسانوں، جانوروں
وَالۡاَنۡعَامِ مُخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهٗ	اور چوپاؤں کے رنگ بھی طرح طرح
كَذٰلِكَ اِنَّمَا يَخۡشَى اللّٰهَ	کے ہوتے ہیں (ان مظاہر ربوبیت کے
مِنۡ عِبَادِهِ الۡعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰهَ	ملاحظے کی بدولت) اللہ سے اس کے
عَزِيۡزٌ غَفُوۡرٌ۔	بندوں میں صرف علماء ہی ڈر سکتے ہیں
(فاطر : ۲۷ - ۲۸)	یقیناً اللہ سب پر غالب اور بخشنے والا ہے۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ جو لوگ مظاہر فطرت کے نظام میں سچے دل سے اور پوری غیر جانبداری

کے ساتھ غور و خوض کرتے ہیں، ان پر خدا کے وجود، اس کی وحدانیت، اس کی قدرت کاملہ اور اس کی ربوبیت
و خلاقیت کا صحیح علم منکشف ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر انہیں معرفت الٰہی پوری طرح حاصل ہو جاتی ہے، جو عین الیقین
اور حق الیقین کے مرتبے تک پہنچا دیتی ہے۔ اس بنا پر اس پر خوف و خشیت طاری ہو جاتی ہے اور یہ عقلی و استدلالی
ایمان روایتی ایمان سے زیادہ مستحکم و پائیدار ہوتا ہے جس کو عقل و فلسفے کے تھپیڑے کسی بھی طرح متزلزل نہیں
کر سکتے اور اس کے حاملین کے پائے ثبات کو لرزا نہیں سکتے۔

حاصل یہ کہ قرآن حکیم کی نظر میں اہل علم، دانشور، مفکرین اور علماء وہ لوگ ہیں جو علوم طبیعی کے ماہرین و متکلمین
ہیں جو مظاہر عالم کے "سینوں" کو چیر کر ان میں ودیعت شدہ "خدائی آیات" یا دلائل ربوبیت کو منظر عام پر لانے والے ہوں۔
کیونکہ صحیفۂ فطرت کے ہر ہر ورق، اس کی ڈالی ڈالی اور بوٹے بوٹے پر خدائی آیات و نشانات منقش و مرتسم ہیں جن سے
ایک اندھا بہرا شخص ہی چشم پوشی کر سکتا ہے۔ یہ تمام مظاہر موجودات اپنے عجیب و غریب اور حیرت انگیز نظام کے
ذریعہ ایک عظیم اور برتر ہستی کے وجود اور اس کی وحدانیت کی خبر دے رہے ہیں جس کا وجود تسلیم کئے بغیر عقلی و
استدلالی حیثیت سے ان کی کوئی بھی تسلی بخش توجیہ و تاویل نہیں ہو سکتی اور حیات و کائنات کے معمے حل نہیں
ہو سکتے۔ بلکہ ہر قدم پر انسانوں کی حیرت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ مختلف "تخلیقی عجوبوں" سے
بھری یہ رنگا رنگ کائنات بھول بھلیوں سے کسی بھی طرح کم دکھائی نہیں دیتی، جب تک کہ اس میں ایک
فوق الطبیعی ہستی کا وجود تسلیم نہ کیا جائے۔

(باقی)

حواشی و مراجع

۱؎ فلسفہ مذہب، مترجم بشیر احمد ڈار، ص ۲۲۰ - ۲۲۴، مطبوعہ لاہور ۲؎ المعجم الفلسفی، مطبوعہ مصر ۳؎ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ۹۲۷/۳ (خورد) ایڈیشن ۱۹۸۳ء ۴؎ میکملن انسائیکلوپیڈیا، ص ۱۷، ۱۹۸۱ء ۵؎ دیکھئے فلسفہ مذہب ص ۲۵۶ ۶؎ ایضاً ص ۲۵۷ ۷؎ ایضاً ص ۲۹۰ ۸؎ تفصیل کے لئے دیکھئے راقم سطور کی کتاب "سورج کی موت اور قیامت"۔ ۹؎ مفردات القرآن، راغب اصفہانی، ص ۵۱۸ - ۵۱۹، مطبوعہ بیروت۔

شکنجے میں جکڑا ہوا فلسطین

از جناب ایڈورڈ سعید صاحب

مترجم جناب محبوب الرحمٰن فاروقی صاحب ٭

(۲)

ان نقشوں پر ایک نظر ڈالنے سے ہی یہ پتہ چل جاتا ہے کہ نہ صرف علاقہ A کے مختلف علاقے
دوسرے سے دور دور ہیں بلکہ وہ سبھی علاقے B کے علاقوں سے گھرے ہیں اور خاص طور پر
قہ C ہے۔ دوسرے لفظوں میں فلسطینی علاقوں کو چاروں طرف سے گھیر کر انہیں بھی مقبوضہ
قہ بنا دیا گیا ہے اور ایسا بہت دنوں سے کیا جا رہا تھا اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ یہ فلسطینی
ارٹی بھی اس سازش میں شریک رہی ہے۔ ۱۹۹۴ء کے بعد سے اس نے ایسے سارے دستاویزوں
نظور کر لیا ہے۔ اکتوبر میں HA'ARETZ کی نمائندہ حمیرا حساس نے لکھا ہے کہ ۱۹۹۳ء
دونوں فریقین نے رضامندی ظاہر کی تھی:

"پانچ سال کی مدت میں فوجوں کو نئی جگہوں پر لگانے کا کام پورا کر لیا جائے گا اور اس
دوران حتمی معاہدے کے لئے مذاکرات ہوتے رہیں گے۔ فلسطینی رہنما اس بات پر
راضی ہو گئے کہ وہ اپنے کشمکش کی مدت کو بڑھا دیں گے خاص طور پر حمس تشدد پسندوں

٭ ایڈیٹر ماہنامہ آجکل (اردو) دہلی۔

کے حملے اور اسرائیلی الیکشن کے مدنظر اس کے منصوبے کو پہلے پہل فلسطینی عوام نے
حالات کو نارمل بنانے کے لئے منظور کر لیا تھا"۔

اور شاید میں نے سمجھا ہو تاکہ اب قبضہ واقعی ختم ہو جائے گا، لیکن اس کا تذکرہ اوسلو
کے کسی دستاویز میں نہیں تھا۔ وہ آگے لکھتی ہیں:

"الفتح (PLO کا بڑا حصہ) دھیرے دھیرے فوجی قبضہ سے گردن چھڑانے کے تصور کی
حمایت میں سب سے آگے تھا۔ اس کے ممبروں میں وہ لوگ آگے آگے تھے جو فلسطین میں
اس کے مخالفوں پر نگاہ رکھتے اور جن مشتبہ لوگوں کے نام اسرائیل سے ملتے انہیں گرفتار کراتے
اور جن لوگوں نے اس محضر پر دستخط کئے تھے کہ اسرائیل کا کوئی ارادہ فلسطینی علاقے کو
چھوڑنے کا نہیں ہے انہیں قید کراتے۔ الفتح کے کچھ ممبروں کو اس سے جو ذاتی منفعت
حاصل ہوئی تھی اکیلے وہی اس سلسلے کی حمایت کرنے کا جواز نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ایک لمبے
عرصے تک انہیں یہ واقعی یقین تھا کہ آزادی حاصل کرنے کا یہی راستہ تھا"۔

منفعت سے حساس کی مراد وہ خصوصی رعایت تھی جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں لیکن
وہ آگے لکھتی ہیں کہ یہ لوگ بھی اس فلسطینی ملک کے افراد تھے جن کے بیوی بچے سبھی نے اسرائیلی قبضے
کے نتائج کو بھگتا اور جو آخر کار یہ سمجھنے پر مجبور ہوئے کہ اس کے سلسلے کی حمایت کا مطلب قبضہ کی
حمایت کرنا ہی ہے۔ وہ آخر میں لکھتی ہیں:

سات سال سے زیادہ ہو چکے ہیں اور آج تک اسرائیل مغربی ساحل کے ۲ر۶۱ فیصد
زمین پر اپنا انتظامی اور فوجی قبضہ بنائے ہوئے ہے اور غزہ پٹی کے ۲۰ فیصد علاقہ C اور
مغربی ساحل کے ۸ر۲۶ فیصد زمین پر تحفظی کنٹرول قائم ہے علاقہ B"۔

اسی قبضہ کے بدولت اسرائیل نے ان علاقوں میں دس سال کے عرصے میں بستیوں کی تعداد

ھا کر دوگنی کر دی ہے اور آج بھی اپنی تفریق کی اسی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے تین ملین فلسطینیوں
پانی کے کوٹے پر پابندی عائد کئے ہوئے ہے اور مغربی کنارے کے فلسطینی ترقیاتی منصوبوں پر
ب لگادی ہے اور پورے ملک کو پابند علاقہ بنا دیا ہے اور ایسی بائی پاس سڑکیں بنائی ہیں جو
مال صرف یہودی کر سکتے ہیں۔ مغربی کنارے پر آمدورفت پر اس تحفظی پابندی کے بدولت
صاف دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح منصوبے کے تحت یہ سڑکیں بنائی گئی ہیں تاکہ یہاں بسنے
ے دولاکھ یہودیوں کو آمدورفت کی ساری آزادی حاصل ہو جب کہ تین ملین فلسطینی اس وقت
محصور ہیں جب تک وہ اسرائیل سے آمدورفت کی اجازت نہ حاصل کرلیں۔

بطور وضاحت اس میں اس بات کا اور اضافہ کر لیا جائے کہ اسرائیل کے لئے پانی کے
ے ذخیرے مغربی کنارے کے حصے میں ہی ہیں اور یہ کہ پورے ملک کی جو تعریف کی گئی ہے اس
ں مہاجرین کو چھوڑ دیا گیا، جنھیں اب یہاں لوٹنے کی اجازت نہیں ہے، اگرچہ کہیں بھی رہنے والے
ں کو اب بھی اس بات کا مکمل حق حاصل ہے کہ وہ جس وقت چاہیں واپس لوٹ سکتے ہیں
آمدورفت پر یہ پابندی غزہ میں بھی اسی طرح سخت ہے جس طرح مغربی کنارے میں اور
س نے غزہ اور مغربی ساحل میں دولاکھ یہودیوں کی جو تعداد بتائی ہے جنھیں آمدورفت کی
حاصل ہے اس تعداد میں وہ نئے اسرائیلی . . . . ۱۵ یہودی رہنے والے شامل نہیں ہیں
شرقی یروشلم کے جوڑائی میں لاکر بسایا گیا ہے۔

فلسطینی اتھارٹی کو اس قدر حیرتناک چالاکی سے گھیرا گیا ہے تاکہ آگے چل کر وہ سارے انتظ
ادا کر دے جسے آج سیکورٹی کمیٹی کے ذریعہ جس میں موسد سی آئی اے اور فلسطینی سراغ
ملہ کے افراد شامل ہیں لاگو کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسرائیل اور اتھارٹی کے اعلیٰ مر
کو تعمیری کاموں کے لئے خام مال تمباکو اور تیل د جس کا سارا منافع اسرائیل کے بینک میں

جمع ہوتا ہے) کی تجارت پر اپنے حقوق جمائے ہوئے ہیں فلسطینیوں کو نہ صرف اسرائیلی فوجی تنگ کرتے
ہیں بلکہ اس کے اپنے لوگ بھی ان لوگوں کے ساتھ مل کر تنگ کرتے ہیں جنھیں فلسطینیوں سے نفرت
ہے۔ اس خفیہ سراغ رساں ایجنسی کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ ایسے سارے مواد کو ضبط کرے جنھیں
اسرائیل کے خلاف بھڑکانے والا سمجھا جائے۔ فلسطینیوں کو البتہ یہ حق نہیں حاصل ہے کہ وہ امریکہ
یا اسرائیل کے بھڑکانے والے مواد کو ضبط کر سکیں۔ امن کے سلسلے میں یہ بہت دھیمی رفتار سے چلنے
والے مذاکرات اور ان پر عمل درآمد پر امریکہ اور اسرائیل یہ جواز دیتے ہیں کہ ایسا صرف اسرائیل کی حفاظت
کے خیال سے کیا جارہا ہے لیکن اس پورے سلسلے میں کہیں بھی فلسطینی حفاظت کا نام نہیں لیا جاتا اور
جیسا کہ یہودیوں کی ہر دلیل ہوتی ہے۔ ان سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ فلسطین کا وجود چاہے وہ کتنی ہی زیادہ
بے اختیار اور محدود ہو اسرائیل کی حفاظت کے لئے ہمیشہ سے نسلی اور مذہبی خطرہ رہا ہے اور سب سے
بڑی حیرتناک بات تو یہ ہے کہ جہاں اسرائیل اور امریکہ میں اتنی زیادہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے اس کے
باوجود تنازعہ کے شدت پکڑنے کے اس دور میں بھی اسرائیل کے ایک ماہر بشریات ڈیبٹی رابن وجہ
نے بڑی ہمت کے ساتھ اسرائیل کے اخبار حارذ (HA'ARETZ) میں ۱۷ اکتوبر کو لکھا کہ اسرائیل
نے ۱۹۴۸ء میں فلسطین کو برباد کر کے جو ابتدائی گناہ کیا تھا اس کی اسرائیل نے نہ تو تردید کی اور
نہ ہی اسے بالکل بھول سکا ہے۔

یروشلم میں ردوبدل اگر مغربی ساحل کے جغرافیے کو اسرائیل کے فائدے اور حفاظت کے
نام پر بالکل بدل دیا گیا ہے تو یروشلم کو تو مکمل طور پر تبدیل کر دیا گیا۔ ۱۹۶۷ء میں جب مشرقی
یروشلم کو اسرائیل کے ساتھ ملایا گیا جس کی وجہ سے اسرائیلی حکومت کے رقبے میں ۷۰ اسکوائر
کلومیٹر کا اضافہ ہو گیا اور اس کے بعد کے مغربی ساحل میں سے ۵۴ اسکوائر کلومیٹر کاٹ کر
یروشلم کے میٹرو پولیٹن شہر سے ملایا گیا اور جب پر مغربی لبرل کے چہیتے ٹیڈی کولک کی بطور میئر حکومت تھی

یہ شخص حارات المغربہ میں سیکڑوں فلسطینی گھروں کو نیست و نابود کرنے کا ذمہ دار رہا ہے تاکہ دیوار گریہ
کے سامنے بہت بڑا پلازہ بنایا جاسکے۔ ۱۹۶۷ء کے بعد سے مشرقی یروشلم کو بہت منظم طریقے سے پوری
یہودی بستی بنا دیا گیا ہے اس کی سرحدوں کو زبردستی اور طاقت کے ساتھ بڑھایا گیا بہت بڑے پیمانے
پر یہاں مکانات تعمیر کئے گئے۔ نئی سڑکیں اور بائی پاس تعمیر کئے گئے تاکہ یہ کبھی بھی واپس نہ لوٹایا جاسکے
اور ساتھ ہی ایسی جگہوں پر جو رہائش کے لائق نہیں تھیں وہاں بسنے والی عرب آبادی کو تنگ و پریشان
کیا گیا اور جیسا کہ ڈپٹی میئر ابراہیم خیلانے جولائی ۱۹۹۳ء میں کہا تھا" میں چاہتا ہوں کہ فلسطینی اس
حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یروشلم اب کبھی بھی اسرائیلی حکومت سے الگ
نہیں ہوسکے گا" (پانچواں نقشہ دیکھیں) ابھی حال ہی میں گیلو کے علاقے میں پڑوسی بیت الجالا گاؤں سے
تھوڑی بہت گولی نئی یروشلم بستیوں کی طرف چلائی گئی اس کی مکمل رپورٹ میڈیا میں اچھالی گئی لیکن
کسی نے بھی یہ نہیں لکھا کہ گیلو کی آبادی بیت الجالا کے علاقے کو چھین کر بسائی گئی ہے۔ کیا فلسطینی اپنے
اس ماضی کو آسانی سے بھول سکیں گے؟

جولائی میں کیمپ ڈیوڈ میں ہونے والی چوٹی کانفرنس اس لئے ناکام ہوگئی کیونکہ اسرائیل اور
امریکہ نے سارے ایسے علاقائی انتظامات کرلئے تھے جن کا میں یہاں تذکرہ کررہا ہوں۔ اس میں بہت
سارا دو بدل صرف اس لئے کیا گیا کہ فلسطین کو "دو قدرتی علاقہ" دیا جاسکے جو ریگستان کا بدلا ہوا نام تھا
اور وہ اپنے کل زمینی علاقے میں کچھ اور اضافہ کرسکیں، اس بنیاد پر کہ فلسطین اسرائیل تنازع کا حتمی
فیصلہ ہوجائے گا۔ یہودیوں کو واپس لینے کے مسئلے سے اسرائیل نے انکار کردیا۔ اگرچہ بہت سے
یہودیوں کے لئے یہ نئی بات نہیں تھی۔ میں نے مغربی میڈیا میں کیمپ ڈیوڈ پر لکھی گئی اکرم جانے کی
رپورٹ کا کوئی حوالہ نہیں دیکھا۔ گرچہ حانے الایام کے ایڈیٹر ہیں اور ۱۹۸۷ء میں انہیں فلسطین سے
نکالے جانے کے بعد وہ عرفات کے بہت نزدیک بھی ہوگئے ہیں۔ حانے نے فلسطینی نقطہ نگاہ سے

یہ واضح کردیا کہ کلنٹن نے اسرائیل کی زبردست حمایت کی تھی اور اپنی پوزیشن کو بچانے کے لئے بارک یہ
چاہتے تھے کہ تمام متنازع مسئلوں پر جیسے رفوجیوں اور یروشلم کا فیصلہ جلد از جلد ہوجائے اور عرفات
ہمیشہ کے لئے اس تنازع کو ختم کرنے کا اعلان کردیں تاکہ (آنے والے الیکشن میں بارک اپنی شکست
کو بچا سکیں)[1]

جو کچھ وہاں ہوا تھا اس کے متعلق حانے کی تفصیلی رپورٹ کا انگریزی ترجمہ جلد ہی واشنگٹن سے
شائع ہونے والے جنرل آف پیلسٹینین اسٹڈیز میں شائع ہوجائے گا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یروشلم پر
اسرائیل کی پوزیشن وہاں کے داہنے بازو کی سیاسی پارٹی کے نظریہ پر منحصر تھی۔ دوسرے لفظوں میں
اسرائیل نہ صرف یروشلم بلکہ الاقصیٰ مسجد پر بھی اپنی حکومت ہمیشہ کے لیے برقرار رکھے گا۔ حانے کا کہنا
ہے کہ اسرائیل یہ چاہتا تھا کہ اسے سب کچھ مل جائے اور بدلے میں وہ کچھ بھی نہ دے اور وہ عرفات
سے اس پوزیشن کی حمایت حاصل کرکے ان سے ہمیشہ کے لئے حتمی فیصلہ کرالے اور وہ اس بات کا
اعلان کردیں کہ آج سے اسرائیل اور فلسطین کا تنازع ختم ہوگیا۔

۱۹۶۷ء کے بعد سے امریکہ نے دو سو بلین ڈالر سے زیادہ کی بغیر کسی شرط کے اسرائیل کو معاشی اور
فوجی امداد دی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے ہر اس طرح کی سیاسی آزادی میں اپنا گہرا تعاون بھی دیا ہے
جس سے اسرائیل جو چاہے کرسکے۔ انگلینڈ جس کی خارجہ پالیسی واشنگٹن کی خارجہ پالیسی کی نقل ہوتی
ہے اسرائیل کو زیادہ سے زیادہ فوجی سامان مہیا کراتا رہا ہے۔ جو سیدھے مغربی ساحل اور غزہ پٹی میں
فلسطینیوں کو مارنے کے لئے بھیجے جاتے رہے ہیں۔ آج تک کسی بھی حکومت نے اتنی زیادہ غیر ملکی
امداد حاصل نہیں کی ہے جتنی کہ اسرائیل نے اور نہ ہی کسی حکومت نے امریکہ کو چھوڑ کر بین الاقوامی
تنظیموں کی تجاویز کا مذاق اڑایا ہے اگر اس بار امریکی صدر کے چناؤ میں الگورے صدر ہوگئے ہوتے تو

[1] اسرائیلی الیکشن کے نتائج آگئے ہیں اور بارک کی شکست ہوگئی ہے۔ مترجم۔

امریکہ کی پالیسی اسی طرح چلتی۔ خیریت یہ رہی کہ بش صدر ہوئے اور انہوں نے اپنی انتخابی مہم
میں عرب امریکہ تعلقات کو اہمیت تو دی ہے لیکن ماضی کے ری پبلکن صدر کی طرح وہ اسرائیل
کے اتنے زیادہ حمایتی نہیں ہوں گے جتنے کہ گورے ہوتے۔

پچھلے سات برسوں سے عرفات اسرائیل کے ساتھ امن قائم کرنے کے معاہدوں پر دستخط
کرتے رہے۔ اس میں کیمپ ڈیوڈ کا معاہدہ آخری ہوتا وہ وہاں سے واپس آ گئے شاید اس لئے کہ
اب تک جو کچھ انہوں نے کیا تھا اس سے وہ آگاہ ہو گئے تھے۔ شاید اس لئے بھی کہ اب انہیں
پتہ چل گیا تھا کہ ان کی مقبولیت کس قدر گھٹتی چلی جا رہی ہے اور اگر آپ وہاں پھیلی بدعنوانیوں،
مطلق العنانی، بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور عوام کی غربت کو ذہن میں رکھیں تو انہیں یہ بھی
احساس ہو گیا تھا کہ آج تک انہیں امریکہ اور اسرائیل نے اپنے مفاد کے لئے زندہ رکھا ہے اور
کسی بغیر کسی حکومت یا حکومت کے تصور کے اور حرم الشریف کے بغیر انہیں اپنے عوام کے غصہ کا
سامنا کرنا پڑے گا۔ نوجوان فلسطینیوں کے لئے اب یہ باتیں برداشت کے باہر ہو چکی ہیں۔ گرچہ
عرفات انہیں اب بھی کنٹرول میں رکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں لیکن اب وہ سڑکوں پر اتر آئے
اور انہوں نے اسرائیل کو بربروں پر پتھر اور گولیاں برسانی شروع کر دی ہیں۔
ماضی میں اسرائیل جن پر انحصار کر رہا تھا خصوصاً اسرائیل کے باہر رہنے والے نامہ نگاروں کی
اور بلکہ ان کی سازشوں اور لاعلمی پر اب اس کا مقابلہ انٹرنیٹ سے حاصل متبادل اطلاعات
دیا ہے۔ متحرک لوگوں نے ایسے مواد کا دفینہ کھول دیا ہے جسے معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی حاصل
ہے۔ اب نہ صرف برٹش نامہ نگاروں (جن کا ہمسر امریکی انتظامیہ کے میڈیا میں نہیں ہے) بلکہ
اٹلی اور مغرب پریس یورپین نامہ نگاروں کے علاوہ الگ الگ اسکالرس کی تحقیق اور آرکائیوز
شدہ معلومات بین الاقوامی تنظیموں اور اقوام متحدہ کی ایجنسیوں اور فلسطین میں کام کر رہے

NGO چاہے وہ اسرائیلی ہوں، یورپین، آسٹریلیا اور شمالی امریکہ کے ہوں، کے علاوہ مصدقہ
اطلاعات ہر جگہ حاصل ہیں۔ اب یہ سب ظلم و جبر اور ناانصافی کے کٹر دشمن بن گئے ہیں۔
اب یہودی فلسطینی تنازع کا سب سے زیادہ شکست آمیز پہلو تو یہ ہے کہ مین اسٹریم اسرائیلی
اور فلسطینی نقطہ نظر میں مکمل بعد ہے۔ ہمیں ۱۹۴۸ء میں اپنے گھروں سے اکھاڑ پھینکا گیا۔ وہ سوچتے
ہیں کہ انہوں نے اپنی آزادی حاصل کی اور یہ کہ جو انہوں نے حربہ استعمال کیا وہ انصاف پر مبنی ہے،
ہمارا کہنا ہے کہ زمین جو ہم سے چھڑائی گئی اور جس علاقے کو فوجی قبضے سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہے
ہیں وہ سب ہمارے قومی میراث کا حصہ ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ اس کی منظوری انہیں مذہبی کتابوں سے
ملی ہے۔ آج کسی بھی پیمانے پر جانچنے کی کوشش کریں ہم تشدد اور ظلم کے شکار رہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ وہ
مظلوم ہیں۔ اس لئے دونوں کے درمیان کوئی مشترک بات نہیں، کوئی مشترک بیانیہ نہیں اور آپسی
مفاہمت کے لئے کوئی راستہ نہیں۔ ہمارے دعوے الگ الگ ہیں حد تو یہ کہ ایک چھوٹے سے
زمین کے ٹکڑے پر عام زندگی مل جل کر گزارنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں ہی علیحدگی ایک
دوسرے کو تنہا اکیلا کرنے اور ایک دوسرے کو بھول جانے کے بارے میں سوچتے ہیں۔

اپنے نقطہ نظر میں تبدیلی لانے کا سب سے زیادہ اخلاقی دباؤ اس وقت اسرائیل پر ہے جو
طاقت ور ملکوں کی حمایت کی بدولت اپنی ساری فوجی کارروائی اور غیر دانشمندانہ امن کی چالوں
کو دیکھنے اور سمجھنے سے معذور ہے کہ عربوں اور مسلمانوں کے دلوں میں وہ ایسی نفرت کا بیج بو رہا ہے
جو برسوں تک ایسے ہی مزاحمت کی شکل میں نکلتا رہے گا۔ آج سے دس سال بعد اس تاریخی فلسطین
عرب اور اسرائیلی آبادی میں برابری ہو جائے گی۔ پھر کیا ہوگا؟ کیا اس وقت بھی اسی طرح ٹینکوں کا
استعمال سڑکوں پر رکاوٹ اور مکانوں کی تاراجی چلتی رہے گی۔ کیا یہ ایک دانشمندانہ فعل نہیں ہوگا اگر
فلسطین اور اسرائیل کے تاریخ داں اور دانشمند مل کر بیٹھیں اور اس تنازع کی صداقت کے بارے میں

پتہ لگانے پر راضی ہوں اور یہ دیکھیں کہ موجودہ صورت حال کی بنیاد پر دونوں پارٹیاں کچھ باتوں پر متفق
ہوجائیں۔ کس نے کس سے کیا لیا، کس نے کس کے ساتھ کیا کیا اور اس طرح کی دوسری باتیں ممکن ہے
اس سے اس موجودہ جمود کو توڑنے میں مدد ملے۔ صداقت کا پتہ لگانے یا کسی مفاہمتی کمیشن کے
قیام کے بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا، لیکن اس سے ملتا جلتا تاریخی حقائق یا سیاسی انصاف
کمیٹی کا قیام عمل میں آسکتا ہے۔

اب ہر شخص پر یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ اوسلو کا پرانا فریم ورک جس سے زیادہ نقصان پہ
ہے اب کسی قابل نہیں رہ گیا ہے (بیرزیت یونیورسٹی کے حال میں کیے گئے ایک پول کے مطابق صرف
۳ فیصد فلسطینی عوام اب مذاکرات کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں) اور یہ کہ یہ مذاکراتی ٹیم جس کی سربراہی
رفات کر رہے ہیں اب نہ تو وہ مذاکرات میں اہم رول ادا کر سکتی ہے اور نہ ہی ملک کو اپنے قابو میں
رکھ سکتی ہے۔ ہر شخص یہ محسوس کر رہا ہے کہ جو ہوا بہت ہوا۔ قبضہ بہت دنوں سے بنا ہوا ہے۔ امن
ذاکرات بھی ایک عرصہ سے چل رہے ہیں جن کا اب تک کوئی مثبت نتیجہ نہیں برآمد ہوا اور نہ ہی کوئی
نتیجہ برآمد ہونے کا امکان ہے۔ رابن پیرس اور ان کے فلسطینی ہم منصب اس ناکامی کے لئے ذمہ دار
یں اور عام آدمیوں کی دشواریاں بھی اب برداشت سے باہر ہوگئی ہیں۔ اس لئے سڑکوں پر پتھراؤ
ے واقعات شروع ہوگئے ہیں گو کہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلنے والا سوائے قتل و خون کے۔ اب
امید رہ گئی ہے کہ ایک سرزمین میں دو مختلف قومیں مل کر ساتھ رہیں۔ کیونکہ گرچہ فلسطینیوں کو اس وقت
مانی کی اشد ضرورت ہے اور ساتھ ہی ہر طرح کے تحفظ کی۔ بارک کا منصوبہ کہ انہیں سزائیں
ے کر ان کی آواز کو بند کر دیں اور انہیں اپنے قابو میں رکھنے کی ساری کوششوں کا نتیجہ سامنے
ور برآمد ہوا ہے لیکن جیسا کہ وہ خود یا ان کے امریکی مالکان سمجھتے ہیں۔ وہ قابو میں نہیں آسکتے
ایسا کیوں ہے کہ اسرائیلیوں کی اکثریت یہ نہیں سمجھتی۔ گرچہ کچھ سمجھنے لگے ہیں کہ عربوں کے خلاف

ظلم وتشدد کی پالیسی دنیا کے ایسے خطے میں جہاں ۳۰۰ ملین عرب اور ۱۲ ملین مسلم رہتے ہیں، سے یہ
یہودی حکومت بہت محفوظ نہیں رہ سکے گی۔

ایڈورڈ سعید کے مضمون پر تاثرات

دسمبر کے شمارے میں شائع ایڈورڈ سعید کے اس مضمون پر کچھ لوگوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے جو ۴ جنوری کے شمارے میں شائع ہوا ہے، ان میں سے ایک ہم یہاں دے رہے ہیں۔ یروشلم سے نومی شیفرڈ لکھتے ہیں " سعید نے جس طرح
ے اوسلو معاہدے کو مسترد کیا ہے اور اس کی وجہ سے اسرائیلی حکومت کے تحت رہنے والے
فلسطینیوں میں امید کی جو کرن بیدار ہوئی تھی اور اس معاہدے کے تحت آپسی تعاون میں
جو پیش رفت ہوئی تھی انہوں نے ان دونوں سے انکار کر دیا ہے۔ اس معاہدے کا اصل مسئلہ
یہ نہیں تھا کہ اسرائیل نے ایک بہت بڑا فراڈ فلسطینی رہنماؤں کی رضامندی سے کیا تھا جیسا کہ
سعید کا کہنا ہے۔ دراصل اوسلو معاہدہ تصفیہ کی طرف اٹھایا گیا ایک سنجیدہ قدم تھا لیکن اس کی
کامیابی اس پر منحصر تھی کہ اس پر فوری طور پر پوری ایمان داری کے ساتھ عمل درآمد کیا جاتا تاکہ
اس سے حاصل ہونے والے فوائد دونوں طرف کے لوگوں کو معلوم ہوجاتے، بجائے اس کے کہ
تشدد پسند عناصر اس کی ترقی میں مزاحم ہوتے۔ ایسا نہیں ہوسکا، اس کی ساری ذمہ داری اسرائیل
پر ہے لیکن فلسطینیوں کو سعید نے بالکل مظلوم اور معصوم بتا کر ان کی کمزوری سے بالکل انکار
کر دیا۔

اتفاق سے ٹائمس لٹریری سپلمنٹ نے اپنے ۲ مارچ کے شمارے میں اسرائیل کے مستقبل کو
لے کر آٹھ مصنفین سے ان کی آرا طلب کی تھیں، ان میں سے کچھ کی رائے درج ذیل ہیں:

(۱) "مشرق وسطی میں غیر متناسب تنازع نے اسرائیلی حکومت کے اندر یہ اعتماد پیدا کر دیا
ہے کہ انہیں یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ فلسطینیوں پر اپنے احکامات نافذ کر سکیں، مقبوضہ علاقوں میں

یوں کے بسانے، زمینوں پر قبضہ کرنے اور مشرقی یروشلم کو اسرائیل میں ملا لینے اور مقبوضہ
قے میں فلسطینیوں پر زبردستی اپنے احکامات نافذ کرنے کی بدولت ان کے اندر یہ اعتماد پیدا
ہے۔ اس لئے اس بات میں کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیئے کہ اسرائیلی تسلط ہی پچھلی دو دہائیوں
سرائیلی فلسطینی مذاکرات ناکام رہا ہے۔ بدقسمتی سے مستقبل کے لئے یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اسرائیل
ریکہ یا یورپ کی طرح لبرل ڈیموکریسی نہیں ہے۔ اسرائیل کے ماہر سماجیات سامی سموہا کا کہنا
سرائیل میں اب نسلی قانون نافذ ہے جس میں سب کے لئے جمہوریت تو ہے لیکن جہاں ہمیشہ
ت کا غلبہ رہے گا اور اسی وجہ سے وہاں کے چیف ربی (اعلیٰ مذہبی پیشوا) کا یہ کہنا ہے کہ "اسرائیل
کی طرح سے منتخب جمہوری حکومت کو یہ حق نہیں حاصل ہے کہ وہ عبادت کو ختم کر سکیں یا یکہ ہمارے بزرگ جو خواب دیکھتے رہے ہیں انہیں چھوڑ دیں۔ اسی وجہ سے خدائی حکم یا ربانی احکام
ے کہ فلسطینیوں کو دوبارہ حق رائے دہندگی سے محروم کیا گیا۔

اسرائیل اور فلسطین کے درمیان پائیدار امن ایک تشنہ خواب رہے گا۔ یہ تنازع اور یہ جھڑپیں
ی سے چلتی رہیں گی۔ جب تک اسرائیلی حکومت مقبوضہ علاقوں میں رہنے والے لوگوں کو قبضہ
ی حاصل کرنے کا حق نہیں دیتی۔ ایریل شیرون کا انتخاب امن کے راستے میں ایک اور
بن گیا ہے لیکن یہ اسرائیل کے اس عقیدے کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ فلسطینی صرف طاقت
جھتے ہیں۔ شیرون کا انتخاب اس نسلی امتیاز کو بھی ظاہر کرتا ہے جس کا سروے سامی سموہا
ا ء میں کیا تھا۔ اس کے حساب سے ۸۵٫۹ فیصد اسرائیلیوں کا کہنا ہے کہ کوئی بھی عرب
رائیل کا صدر نہیں ہو سکتا۔ جب کہ ۴۴ فیصد لوگوں کا کہنا تھا کہ اعلیٰ عہدوں پر صرف
کا ہی انتخاب ہونا چاہیئے اور ۳۶٫۷ فیصد لوگوں کا خیال تھا کہ اسرائیل کو ایسے مواقع
ہئیں جس کے سبب فلسطینی ملک چھوڑنے پر راضی ہو جائیں۔ یہ اعداد و شمار خود ہی اس

علاقے میں اس نازک صورت حال کا اظہار کرتے ہیں۔" (یاسر سلیمان)

(۲) سولہویں اور سترہویں صدی میں جب عیسائی یورپ یہودیوں کو قتل کر رہا تھا تو
انہیں اسلامی دنیا نے پناہ دی تھی۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان تنازعے
کا کوئی سبب نہیں ہونا چاہیئے۔ دونوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ کھانے پینے کے احکام،
پدری نظام، قوانین کی بالادستی، صحیفوں کی زبان وغیرہ وغیرہ۔ یہ مماثلت عیسائیت سے نہیں ملتی
بہت سے یہودی اسرائیلی عرب دنیا کے باشندے ہیں۔ ان کی مادری زبان عربی تھی ابھی صرف
ایک صدی پہلے عثمانی حکومت مختلف نسلی گروہوں کا ایک جھنڈ تھا۔ ان کے شہروں میں بہت
بڑی تعداد میں یہودی، آرمینیائی، کرد، اطالوی، یونانی اور مالٹائی لوگ رہا کرتے تھے بیسویں صدی
عیسوی میں پیدا ہوئی قومیت نے ان علاقوں کا بٹوارا کر دیا۔ اطالوی، یونانی اور مالٹائی اپنے اپنے
ملک کو واپس چلے گئے۔ آرمینیائی ساری دنیا میں پھیل گئے بشمول سوویت آرمینیا کے۔ کردوں کا
کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ جب کہ یہودیوں نے فلسطینیوں کو بے دخل کر کے اپنا ایک ملک اور حکومت
قائم کر لی۔ اس طرح سے اسرائیل عثمانی حکومت کی وارث حکومت ہوئی۔

لیکن یہودیوں میں جو زایونسٹ تحریک چلی تھی اسے یورپین ممالک نے مختلف سیاسی اور
سماجی اسباب کی بنا پر اپنے یہاں سے کھدیڑ دیا۔ زایونسٹ کی فلسطین میں زمین پر قبضے کی پالیسی
یورپین کالونیائی پالیسی سے مماثلت رکھتی ہے کہ لوگوں کو بے دخل کر دو۔ جیسے فرانس نے
الجیریا یا برطانیہ نے مشرقی افریقہ میں کیا تھا۔ یورپین برتری کے احساس نے یہ تحریک پیدا
کی کہ عرب کے رہنے والے یہودیوں کو عرب مخالف بنا دیا جائے۔ اسرائیل کے پہلے وزیر اعظم
ڈیوڈ بنگورین نے کہا تھا "ہم نہیں چاہتے کہ اسرائیلی عرب بنیں"۔ اس لئے باہر سے آنے والے تمام
اسرائیلیوں کو ٹرانزٹ کیمپ میں رکھ کر تعلیم دی گئی کہ وہ یورپین کی طرح برتاؤ کریں اور اپنے

ب اسلامی وراثت سے یکسر انکار کریں۔

اسرائیل کی آبادی کا چھٹا حصہ فلسطینیوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے اکثر نے ہبرو زبان کو
اول ادبی زبان کے طور پر اختیار کر لیا ہے۔ ان کے تھیٹر شاعری اور اسکالر شپ میں بہت
دہ مماثلت ہے۔

ایک مضبوط اسرائیل امن قائم کرنے میں سراسر ناکام رہا ہے اور شیرون کی حکومت
سی بہتری کی توقع نہیں۔ بشرطیکہ ان کی اس انتخابی فتح سے بہت زیادہ اسرائیلی
ملک چھوڑنے پر نہ آمادہ ہو جائیں کیونکہ وہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ امن کے
ھ رہنا چاہتے ہیں۔ اسرائیل میں اس وقت جو سیکولر تمدنی ترقی ہو رہی ہے اس سے
ی امیدیں وابستہ ہیں۔ (پیٹر کلارک)

(۳) یروشلم کی ہبرو یونیورسٹی کے ماہرین جغرافیہ کی پیشین گوئی کے مطابق اگلی نسل
دا اسرائیل میں یہودیوں کی مکمل اکثریت ہو جائے گی۔ لیکن اس دوران اسرائیل
آنے والے یہودیوں کی تعداد مستقل گھٹتی جارہی ہے اور سابق سوویت یونین سے
یوں کے مکمل اخراج کے بعد اب کوئی نئی بڑی تعداد اسرائیل میں آنے والی نہیں لیکن
سرائیل میں رہنے والے عرب اور یہودی پہلے سرحدی علاقوں میں رہنے والے عربوں کا
شی تناسب صرف ۲۰ فیصد رہا ہے جس میں اب تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور خود
یل میں رہنے والے ہزاروں غیر یہودی باشندے خود ترکی، رومانیہ، ملیشیا اور
سے آکر یہاں بس گئے ہیں، جلد ہی ان کی آبادی پوری آبادی کی ایک تہائی
ئے گی۔ اس سے امید ہے کہ اگلے دو یا تین دہائیوں میں اسرائیل ایک کمتر یہودی
ہو جائے گا۔ حال کے چناؤ میں اسرائیلی عرب نے جو بائیکاٹ کا نعرہ دیا تھا وہ ثابت

کرتا ہے کہ اب اسرائیلی عرب برابر کے حقوق مانگنے میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں اور لاکھوں
کی تعداد میں روس سے آنے والے یہودیوں کے سبب جو سب کے سب لادین ہیں اسرائیل میں جو
پہلے سیکولر عناصر کے خلاف مزاحمت چل رہی تھی کمزور پڑ گئی ہے۔ تل ابیب ابھی سے ایک لادینی
مابعد جدید میٹرو پولیٹن بن گیا ہے۔

باوجود اس کے کہ امریکہ کے محکمۂ خارجہ کے سکریٹری کالن پاویل نے جو سب سے
پہلا حکم نامہ جاری کیا کہ آج سے خارجہ پالیسی کے تحت اسرائیل اور فلسطین کے درمیان ہونے
والی بات چیت کے لئے لفظ امن کا استعمال نہیں کیا جائے گا۔ امریکہ کو اسرائیل کی حمایت
جاری رکھنی پڑے گی۔

اس کے ساتھ ہی پانی کے ذخائر کے سلسلے میں بھی کچھ کرنا پڑے گا۔ کیونکہ گلیلی کے سمندر
سے جو پانی کا ذخیرہ حاصل کیا جاتا تھا وہ خطرے کے نشان تک نیچے پہنچ گیا ہے۔ اس لئے ترکی سے
پائپ لائن کے ذریعہ پانی کی فراہمی ناگزیر ہو گئی ہے۔ لیکن اس کے لئے ضرورت ہے کہ شام کے
ساتھ ہمارا مکمل امن معاہدہ ہو۔ (برنارڈ وسرسٹین)

پہلا ہندوستانی مورخ

مولانا ضیاء الدین برنی

از
ڈاکٹر محمد معتصم عباسی آزاد٭

ہندوستان میں تاریخ نویسی کا فن ترک لائے تھے اور جس شخص کو پہلا ہندوستانی مورخ
نے کا شرف حاصل ہوا وہ خواجہ ضیاء الملت والدین[1] مولانا ضیاء الدین برنی تھے۔ برنی سے
ن مورخوں نے ہندوستان کی تاریخ لکھی ان کا تعلق بیرون ہند سے تھا۔ ابوریحان البیرونی
ھ/۱۰۳۹)، ابونصر عتبی (۴۳۰ھ/۱۰۳۹) اور ابوالفضل بیہقی (۴۷۰ھ/۱۰۱۷) وسط ایشیائی
اسی طرح ہندوستان کے عہد سلطنت کے مورخین میں حسن نظامی (۶۲۶/۱۲۲۹) نیشاپور
شندے تھے اور منہاج سراج (۶۷۳ھ/۱۲۷۴) جوزجان کے رہنے والے تھے۔ ضیاء الدین
صغیر ہندوپاک کے پہلے مورخ ہیں جو ہندوستان میں پیدا ہوئے اور جریدۂ روزگار پر
م بحیثیت ایک عظیم مورخ کے ثبت کرکے بقائے دوام حاصل کیا۔

لیکن یہ حالات کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ جس شخص نے ہندوستان کے قرونِ
کے تین حکمراں خاندانوں کے بانوے سالہ دور حکومت کے تاریخی و سیاسی واقعات اور

[1] ب مصنف "سیر الاولیاء" کا دیا ہوا ہے جنھوں نے برنی کو آخری زمانے میں دیکھا تھا۔ سیر الاولیاء ص۳۱۲-۳۱۳

٭ شعبہ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

اس کے علمی و تہذیبی حالات کو قلم بند کرکے تاریخ کے صفحات میں محفوظ کر دیا وہ خود تمام عمر گمنامی کا شکار رہا۔ اس کے حالات زندگی تو کیا صحیح سن پیدائش و وفات کے ذکر تک سے تذکرے خالی ہیں۔ معاصرین و متاخرین نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ جو کچھ معلومات میر خورد نے "سیر الاولیاء" میں فراہم کی ہیں[1] ان کے علاوہ ہماری معلومات کا واحد ماخذ وہ بیانات ہیں جو خوش قسمتی سے خود برنی نے ضمنی طور پر کہیں کہیں اپنی تاریخ میں دے دیا ہے۔

برنی کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک معزز خاندان کے فرد تھے[2] جو نسباً شیخ تھے۔ لیکن ماں و دادی سیدانیاں تھیں۔ ان کی ماں اس دور کی ایک اہم شخصیت سید جلال الدین کیتھلی کی بیٹی تھیں[3]۔ ان کا خاندان دلی کے حکمراں طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کے دادا سلطان غیاث الدین بلبن (۶۸۶/۱۲۸۷) کے وزیروں میں تھے[4]۔ ان کے والد موید الملک سلطان جلال الدین خلجی (۶۹۵/۱۲۹۶) کے ابتدائی عہد میں اس کے دوسرے بیٹے ارکلی خاں کی نیابت پر مامور تھے۔ کیلوکھری کے نواح میں ایک عالی شان مکان میں سکونت تھی[5]۔ ان کے چچا

[1] سیر الاولیاء ص۳۱۲-۳۱۳ [2] تاریخ فیروز شاہی ص۳۵، "پدر این ضعیف شریف بود"۔ سیر الاولیاء ص۳۱۲-۳۱۳ "پدر بزرگوار کہ از دودمان بزرگ بود" [3] تاریخ فیروز شاہی ص۳۵

"... و بزرگی سادات کیتھل و صحت نسب ایشاں مشاہیر است پدر مولف بنسبۂ دختر آں سید جلال الدین کیتھلی است و سید جلال الدین از عظام و کرام کیتھلی بودہ است ... جدہ این ضعیف سیدہ و صاحب کشف و کرامت بودہ است۔"

[4] تاریخ فیروز شاہی ص۱۵۹، علاء الدین خلجی نے ایک موقع پر علاء الملک کو وزیر زادہ کہا تھا۔

"... شما می دانید کہ علاء الملک وزیر زادہ است۔"

[5] ایضاً ص۲۰۰ "من کہ مولف ام در عہد جلالی پدرم نائب ارکلی خاں بود و خانہ در کیلوکھری بس بلند و رفیع آورد۔"

ا الملک سلطان علاء الدین خلجی (۷۱۵/۱۳۱۶) کے زمانۂ شہزادگی میں جب وہ کڑہ کی
بت پر مامور تھا اس کے معتمد خاص تھے۔ وہ امرا کی اس جماعت میں شامل تھے جس نے
الدین کو قتل کر کے علاء الدین کو تخت وتاج دلانے میں مدد کی تھی۔[1] علاء الملک کی
پر علاء الدین کو بڑا اعتماد تھا۔ اس کا اندازہ ان دو واقعات سے ہوتا ہے۔ کڑہ کی صوبیداری
نے میں جب علاء الدین دیوگیر کی مہم پر روانہ ہوا تو کڑہ میں علاء الملک کو اپنا نائب
کے سارا انتظام اس کے حوالے کر گیا تھا۔ اسی طرح بادشاہ ہونے کے بعد جب مغلوں
اتر حملوں سے پریشان ہو کر ان کی سرکوبی کے ارادے سے دلی سے باہر نکلا تو اپنے
عیال اور شاہی خزانے علاء الملک کی حفاظت میں دے گیا تھا۔[2]

علاء الدین جب تخت سلطنت پر بیٹھا تو اس نے برنی کے والد موید الملک کو برن
شہر) کی نیابت عطا کی۔[3] ان کے چچا علاء الملک کو دہلی کے کوتوال کے اہم منصب پر

فیروز شاہی، ص ۳۷-۳۲۶۔

.... والغ خاں ونصرت خاں وظفر خاں والپ خاں وملک علاء الملک عم مولف وملک
جونا داد بک، ملک صغری سرجاندار، ملک تاج الدین کافوری کہ عمدہ ملک جلالی بودند
پرداخت امور عظام ملکی نظیر خود نداشتند واز روی ظاہر بینش آدمی زاد ایشاں در قتل
سلطان جلال الدین باعث ویار بودند۔"

.... در غیبت خود نیابت کڑہ واودھ بعم مولف علاء الملک کہ از مختصان او بود تفویض کرد۔" [ص ۲۲۲]

... ودراں ایام عم مولف ملک علاء الملک کہ از مختصان ورای زن سلطان علاء الدین بود
الملک دہلی داشت سلطان شہر وحرم وخزائن را بدو سپردہ بود ودر قصد حرب بزرگ
ں آمد۔" ص ۲۵۵ [3] ایضاً ص ۲۴۸۔

فائز کیا۔[1] اسے ہمیشہ افسوس رہا کہ علاء الملک کی غیر معمولی فربہی کے باعث وہ اسے اپنا
وزیر نہ بنا سکا۔[2] لیکن ملک کے انتظامی امور اور سیاسی معاملات میں ہمیشہ انہیں سے
مشورہ کرتا تھا اور ان کے مشوروں کو بڑی وقعت دیتا تھا۔ علاء الملک بھی دیانت داری،
خلوص اور بے باکی سے اسے مشورے دیا کرتے تھے۔ جب پے در پے فتوحات، سیاسی
استحکام اور دولت کی فراوانی کے باعث عوام کے معتقدات کو بھی مسخر کرنے کے لئے
علاء الدین کے دماغ میں ایک نئے مذہب کے اجرا کا فتور پیدا ہوا تو یہ علاء الملک تھے
جنھوں نے اسے اس ارادے سے باز رکھا۔ انہوں نے اسے سختی سے سمجھایا کہ "دین شریعت
ومذہب کار انبیا است نہ پیشۂ بادشاہاں"۔ اور اسے متنبہ کیا کہ اگر بادشاہ اس طرح کے
فاسد خیالات کا اظہار لوگوں سے کرے گا تو وہ ملک میں فتنہ کھڑا ہو جائے گا کہ "بر لمے صد
بزرجمہر فرو نہ نشیند"۔[3]

برنی نے اپنے دادا کے بارے میں تفصیل نہیں دی ہے۔ لیکن قرائن اس قیاس کی
تائید کرتے ہیں کہ وہ سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں برن (بلند شہر) کے عامل یا مقطع
تھے۔ برنی یہیں ۶۸۳/۱۲۸۴ میں پیدا ہوئے۔[4] بلبن کے جانشین سلطان معز الدین کیقباد
(۶۸۹/۱۲۹۰) کا عہد ان کی کمسنی کا تھا۔[5] سلطان جلال الدین خلجی کے عہد میں سن شعور کو

---

[1] تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۴۹-۵۰ [2] ایضاً ص ۲۵۹ [3] ایضاً ص ۲۶۲ تا ص ۲۷۲ [4] برنی کی سن
پیدائش ووفات کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ "تاریخ فیروز شاہی" کی تکمیل کے وقت ان کی عمر ۷۴ (چوہتر) سال تھی۔
"تاریخ فیروز شاہی" کی تکمیل ۷۵۷/۱۳۵۷ میں ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے سن پیدائش (۶۸۳/) یا اس کے آس
پاس ہے [5] تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۵، "ایں ضعیف در جلوس سلطان معز الدین کیقباد نبیسۂ
سلطان بلبن خرد بودہ است۔"

علیم کا سلسلہ جاری ہوا[1]۔ سلطان علاء الدین خلجی کے دور میں تعلیم مکمل ہوئی۔

ار الدین خلجی کا عہد علمی اور تہذیبی اعتبار سے ممتاز تھا اور بقول سید حسن برنی "اس دور کا
کے ان ادوار میں ہوتا ہے جن میں نامعلوم طریقوں پر حیرت انگیز واقعات رونما ہوئے
ت کے مختلف شعبوں میں بلا کسی ارادہ و اہتمام کے بڑی بڑی شخصیتیں وجود میں آئی ہیں۔
اور ایران میں منگولوں کی غارت گری اور ہلاکت خیزیوں کے باعث ان کے ممالک
ہر فن کے نابغہ روزگار شخصیتوں کو علاء الدین خلجی کی کسی ذاتی خواہش یا کوشش کے
ت دہلی میں جمع کر دیا تھا۔ جن کے وجود سے بقول برنی دہلی علمی اور تہذیبی لحاظ سے
اد' غیرت مصر' ہمسر قسطنطنیہ اور متوازی بیت المقدس ہو گئی تھی[2]۔ ان کا دعویٰ

۔ آنچناں استادان فن کہ ہر یکی علامہ وقت بود' در بخارا و سمرقند و بغداد و مصر و
م و دمشق و تبریز و صفاہان وری و روم و در ربع مسکون نباشند و در ہر علمی کہ ذہن
از معقولات و منقولات و بدیع و بیان و کلام و منطق موی می شگافند"۔

تاریخ میں انہوں نے ایسے سینتالیس علماء و فضلا کا نام لیا ہے جن کے بارے میں ان کا
ہے

نی از ان استادان در فنون علم و کمالات علم بدرجۂ غزالی و رازی رسیدہ بودند"
ا بیان ہے کہ ان "استادان سر آمدہ" سے جتنے طلبہ تلمذ حاصل کرتے تھے وہ "درجۂ
خ کر" جواب دادن فتویٰ" کے مستحق ہوتے تھے[5]۔

ہی صہ ۲۰ ۔ منکہ مولف تاریخ فیروز شاہیم در عہد جلالی قرآن تمام کردہ بودم و از مفردات گذشتہ
ۃ ایضاً صہ ۳۲ ۳ ایضاً صہ ۵۳ - ۳۵۲ ۴ ایضاً ۵ ایضاً۔

برنی نے اسی علمی و تہذیبی ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ حصول تعلیم کے لئے انہیں وہ تمام امکانی سہولیات میسر تھیں جو اس زمانے کے طبقۂ امراء کی اولادوں کے لئے مخصوص تھیں۔ برنی نے اپنے استادوں کا نام نہیں لیا ہے لیکن جن علماء کے نام انہوں نے گنائے ہیں ان میں سے اکثر کی خدمت میں حاضر ہو کر زانوئے تلمذ تہ کیا تھا اور بیشتر کو "مسند افادت" اور مجلس و محافل میں دیکھا تھا[1]۔

برنی نے علوم و فنون کی کن شاخوں میں دستگاہ بہم پہنچائی اور کن میں عبور حاصل کیا تھا، اس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ انہوں نے ساری عمر ہر موضوع پر متقدمین اور متاخرین کی تصانیف کے مطالعہ میں گزارا ہے۔ ان کے نزدیک حدیث' تفسیر' فقہ اور طریقت کے بعد اگر کوئی علم نافع ہے تو وہ تاریخ ہے[2]۔ وہ علوم عقلی سے انتہائی نفرت و بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ بادشاہ کو مشورہ دیتے ہیں کہ بد دینوں اور اہل فلسفہ کو اپنی مملکت سے باہر کر دے۔ ان کا خیال تھا کہ محمد بن تغلق کی طبیعت میں شقاوت و سفاکی کا سبب معقولات فلاسفہ سے اس کی شیفتگی تھی[3]۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ برنی کی تعلیم خالص مذہبی بنیادوں پر ہوئی تھی، وہ اپنے والد کے وسیلے سے اوائل عمر ہی میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ محبوب الٰہی (۲۵/۱۳۲۴ء) کے مرید ہو چکے تھے[4]۔ بچپن ہی سے ان کا ذہنی میلان تصوف

---

[1] تاریخ فیروز شاہی' ص ۳۵۱ "من در پیش بعضی تلمذ کردہ ام و بخدمت بعضی رسیدہ و بیشتر را" در مسند افادات" در مجلس و محافل دیدہ"۔ [2] ایضاً ص ۹ "چنیں گوید گنہگار بندہ ... ضیا برنی کہ عمر بندہ در تصفح کتب گذشتہ است و ہر علمی بسی تصانیف سلف و خلف مطالعہ کردہ ام و بعد از تفسیر' حدیث' فقہ و طریقت مشائخ' ہیچ علمی و عملی چنداں منافع مشاہدہ نکردہ ام کہ در علم تاریخ"۔ [3] ایضاً ص ۴۳ و ص ۴۵۶ "از جہت معقولات فلاسفہ کہ مایۂ شقاوت و سنگدلی است دل او را فرا گرفتہ"۔ [4] سیر الاولیاء' ص ۳۱۳-۳۱۲۔

طرف تھا۔ انہیں درویشوں اور فقیروں سے ملنے کا شوق تھا۔ جلال الدین خلجی کے عہد میں یک
درویش سیدی مولہ کی کرامات کا شہرہ ہوا اور ان کے گرد عوام و خواص کا مجمع لگا رہنے لگا تو
نی بھی اپنے استادوں کے ساتھ ان کی زیارت کو جایا کرتے تھے[1] جب جلال الدین خلجی کو
ری مولہ کی غیر معمولی مقبولیت سے سیاسی خطرہ محسوس ہوا تو اس نے انہیں قتل کروا دیا تھا
ں نے جلال الدین کے عہد میں وقوع پذیر ہوئے بعض غیر معمولی واقعات کو مثلاً سیاہ آندھی
ٹھنا، قحط پڑنا اور بھتیجے علاء الدین کے ہاتھوں خود جلال الدین کے قتل کو سیدی مولہ کے
ن ناحق" کا نتیجہ قرار دیا ہے[2] اس سے برنی کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مذہبی تعلیم اور تصوف کی طرف مخصوص ذہنی میلان کے باوجود ہم برنی کا شمار نہ تو علماء
ریخ کے اس طبقہ میں کر سکتے ہیں جن کی زندگی قال اللہ و قال الرسول میں بسر ہوتی ہے
ان متقی اور پرہیزگاروں میں کیا جا سکتا ہے جن کا تقویٰ و طہارت انہیں ہر اس چیز سے
ر رکھتا ہے جسے شریعت حرام قرار دیتی ہے۔ برنی کا تعلق دلی کے طبقہ امراء سے تھا۔
خاندان کے لوگ حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز تھے۔ انہیں عیش و عشرت سے بہرہ اندوز
کے لئے وہ سارے اسباب اور آزادیاں میسر تھیں جو ترکوں کے حکمراں طبقہ کی معاشرتی

[1] تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۰۹، "با استاداں در فیتقال بزیارت سیدی مولہ آمدم و او را زیارت کردم
شدہ ام" [2] ایضاً ص ۲۱۲، "من مولف ام یاد دارم کہ روز قتل سیدی مولہ بادلی سیاہ
کہ عالم تاریک شد و بعد قتل سیدی مولہ ملک جلالی فتور گرفت ... ہمدراں نزدیکی کہ مولہ کشتہ شد
راں شد و در دہلی قحط افتاد و غلہ بیک جتیل سیری رسید۔ در زمین ختو الک قطرہ باراں نہ چکید
ان دیار با زن و بچہ در دہلی می آمدند و بہ بستگان دس گاں یکجا می شدند و در گرسنگی خود را در
ی انداختند و غرق شدند۔

زندگی کا لازمی جز تھیں۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ بے فکری اور آزادہ روی میں گزرا عنفوان
شباب ہی سے دلی کی عیش و نشاط اور رقص و سرود کی محفلوں اور رنگین صحبتوں میں حصہ لیتے
رہے، خانقاہ گزینی یا درس و تدریس اور قضا و افتاء کی مسند نشینی کی طرف نہ تو ان کا رجحان تھا
اور نہ کوئی ذہنی مناسبت تھی۔ وہ دربارداری کے قواعد اور ندیم سلطانی کے آداب و اصول
سیکھنے کے لئے اپنے بزرگوں کے ہمراہ جلال الدین خلجی کے بزم رقص و سرود میں شریک ہوا
کرتے تھے، وہ طبعاً خوش دل، ظریف اور یار باش تھے[1] انہیں اپنے دور کے بادشاہوں،
امیروں، عالموں، شاعروں، ادیبوں اور بہترین اشخاص کی صحبتیں ملی تھیں، جس محفل میں
شریک ہوتے اپنی بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی کی بدولت اس میں جان ڈال دیتے
تھے۔ ان کی راتیں سلطان کی بزم خاص میں شراب و سرود اور رقص و موسیقی کے مشاغل میں
گزرتی تھیں۔ ان کے دوست امیر خسرو اور امیر حسن سنجری بھی ان کے شریک ہوتے تھے۔
تینوں حضرت محبوب الٰہی کے مرید تھے اور تینوں سلطانوں کے ندیم بھی تھے۔ تینوں آخری عمر
میں تائب ہونے سے قبل ترکوں کے حکمراں طبقے کی رنگ رلیوں کا مزہ اچھی طرح چکھ چکے تھے
تینوں پر اس کا ردعمل مذہبی احساسات کے شدید غلبہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ چوہتر (۷۴) سال
کی عمر میں جب کہ وہ تائب ہو کر گوشہ نشیں ہو چکے تھے ان دنوں ان محفلوں اور ان صحبتوں کو
یاد کر کے بے چین ہو جاتے ہیں[2]

"... درچنیں ہنگامے کہ از پیری و ضعیفی یک دنداں در دہنم نماندہ است و پریشان
خاطر و کام دشمن گشتہ ام و در لگد کوب دشمناں و حاسداں پست شدہ جوانیہا از سر

[1] سیر الاولیاء، ص ۳۱۲، "در واسطہ لطائف طبع کہ در زمان خویش در فن ندیمی زیر کبودی آسمان
مثل نداشت"۔ [2] تاریخ فیروز شاہی، ص ۱۶۵۔

یاد می آید و مجلسہا و عیش ہای گذشتہ کہ در میان عالی ہمتاں و بزرگ منشاں گذرانیدہ ام در مجلس[1] من خوبرویاں خوب طبعاں و ظریفاں بی بدل و خوبرویان طاق و گلعذاران سیمیں ساق و ساقیان سرو قد و امردان شکرلب و مطربان متنشی[1] و غزلخوانان ممتاز بسیار بودندی و در دلم می خلد۔ امروز چہ از قحط طوائف مذکور و چہ از بے کسی و بی زری در کنج محنت و گوشہ مذلت خوار و زار و ذرۂ بی مقدار و بی خریدار ماندام ——— چہ کنم؟ "

(ترجمہ) اس وقت جب کہ بڑھاپے اور کمزوری کے باعث منھ میں ایک دانت نہیں رہ گیا ہے۔ ناکام و نامراد و پریشاں خاطر ہوں اور دشمنوں اور حاسدوں کے لکد کوب سے خستہ ہوچکا ہوں، وہ جوانیاں، وہ مجلسیں اور عیش و عشرت کے وہ دن جو عالی ہمتوں اور بزرگ منشوں کی صحبتوں میں گزارے تھے دوبارہ یاد آتے ہیں۔ میری مجلس میں خوب رویوں، خوش طبعوں، ظریفان بی بدل، حسینان طاق، گلعذاران سیمیں ساق، ساقیان سرو قد، امردان شکرلب مطربان متنشی[1] اور غزلخوانان ممتاز کی کثرت تھی۔ ان کی یاد دل میں چٹکیاں لیتی ہے۔ ان دنوں کچھ تو مذکورہ طائفوں کے قحط اور کچھ اپنی مفلسی و ناداری کے باعث کنج غم اور گوشہ مذلت میں خوار و زار بے حیثیت اور کس مپرسی کے عالم میں پڑا ہوں ——— کیا کروں؟۔

عرصہ گزر جانے کے بعد بھی سلطان جلال الدین خلجی کی محفل عیش و نشاط اور رقص و سرود کی محفلوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے جذبات بے قابو ہو جاتے ہیں۔ وہ توبہ و تقویٰ کو بھول کر

[1] اس جملے سے ثابت ہوتا ہے کہ برنی عیش و نشاط کی ذاتی محفلیں بھی منعقد کرتے تھے جس کی تائید اس اقتباس کے آخری جملے سے ہوتی ہے۔

اس محفل کے ساقیوں، مطربوں، رقاصاؤں، غزلخوانوں اور خوب رویوں کو نام بنام یاد کرتے ہیں۔

"..... ساقیان مجلس سلطان پسران ہیبت خان و نظام خریطہ دار و یلدز سرسانی بودند و جمالی و حسنی و کرشمہ داشتند کہ ہر زاہدی و متعبدی کہ نظر در روی ایشان نکردی زنار در میان بستی و مصلی را بوریای خانہ خمار ساختی و سبو خماراں بر سر کشیدی و در عشق آں بی بدلاں توبہ شکن فضیحت و رسوا شدی و از مطربان مجلس سلطان محمد شاہ چنگی چنگ زدی و فتوحہ خاتون دختر فقاعی و نصرت خاتون سرود گفتندی کہ از آواز سادہ و بادہ ایشان مرغ از ہوا فرود آمدی و ہوش از سامعان رفتی و دلہا بطبیدی و جانہا در ہزاہز شدی۔ دختر خاصہ نصرت بی بی و مہرا فروز از نہایت حسن و غایت نمک و تنگ در ہر جا بی کہ میدیدند کرشمہ میکردند و ہر غمزہ ای کہ میزدند کان نمک ریختند۔ در مجلس سلطان پاکو فتندی و ہر کہ پاکو فتن و کرشمہ و ناز کردن ایشان بدیدی خواستی کہ جان خود را بر سر ایشان نثار کند و تا زید چشم از زیر پای ایشان بر ندارد" [1]

(ترجمہ)..." سلطان کی مجلس کے ساقیوں میں ہیبت خاں اور نظام خریطہ دار اور یلدز سرسانی کے بیٹے تھے۔ جن کے حسن و جمال اور کرشمہ و ناز کا عالم تھا کہ جس عابد و زاہد کی نگاہ ان پر پڑ جاتی تھی وہ زنار باندھ لیتا اور مصلی کو شراب خانے کا بوریا بنا لیتا تھا، سر پر خماروں کا سبو رکھ کر ان بے بدلوں اور توبہ شکنوں کے عشق میں خود کو فضیحت و رسوا کر لیتا تھا۔ سلطان کی مجلس کے مطربوں میں محمد شاہ چنگی چنگ بجاتا تھا، فتوحہ خاتون اور فقاعی کی بیٹی نصرت خاتون گاتی تھیں۔ جن کی سادہ و دلکش آواز سے فضا میں اڑتے پرندے نیچے آجاتے تھے۔ سامعین کے ہوش اڑ جاتے تھے۔

[1] تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۰۱-۱۹۹۔

لوگوں کے دل دھڑکنے لگتے تھے اور جانیں دگرگوں ہوجاتی تھیں۔ خاصہ کی بیٹیاں نصرت
بی بی اور مہر افروز جو اپنے غایت درجہ حسن اور نمک اور شوخی کی بدولت جس طرف بھی نظر
ڈال دیتی تھیں یا شوخی دکھاتی تھیں یا ہر وہ غمزہ جو وہ کرتی تھیں گویا کان نمک چھڑکتی
تھیں، سلطان کی مجلس میں رقص کرتی تھیں۔ جو کوئی بھی ان کا رقص، کرشمہ و ناز دیکھتا تھا
یہی چاہتا تھا کہ اپنی جان نثار کر دے اور جب تک زندہ رہے اپنی نظر ان کے پاؤں
کے نیچے سے نہ ہٹنے دے۔"

سلطان کی اس مجلس میں ان کے دوست امیر خسرو روزانہ "پسران ماہر و" "امردان
چہار ابرو" "نوخطان شعاری انداز" اور "جاں نوازی دلربایان مایہ ناز" کے وصف و جمال
حسن و کرشمہ پر تر و تازہ غزلیں کہہ کر لاتے تھے[1]

"در وصف جمال سادہ پسران ماہرو و در حسن و کرشمہ امردان چہار ابرو و در دل
ربودگی نوخطان شعاری انداز و در جاں نوازی دلربایان مایہ ناز غزلہای تازہ و تر
آوردی۔"

ان کی غزلیں ساقیوں کی نوشا نوش کی آوازوں، امردوں کی فحش گوئی و تندی،
وشوں کے ناز و نخرے، گانے اور سیمبروں کی کمر لچکانے کی حالت میں پڑھی جاتی تھیں۔
نی کا کہنا ہے کہ اس طرح کی مجلسیں "جز بخواب نتواں دید" ان مجلسوں کو "از مجالس دنیا
واں گفت و نتواں دانست"۔ کیونکہ یہ وہ مجلسیں ہیں جن میں بے دلوں کی جان میں جان
جاتی تھی۔ عاشقوں کو نئی زندگی مل جاتی تھی۔ خوش طبع لوگ بہشت بریں کا نظارا کرتے
ے۔ نازک مزاج لوگ جان و جہان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ ان مجلسوں میں حوریں

[1] تاریخ فیروز شاہی،

دربانی اور پریاں خاکروبی کرتی تھیں۔ ان کا فیصلہ ہے کہ جس نے بھی ان مجلسوں میں شرکت
کی اور مست نہ ہوا وہ بے خبر اور جو دیوانہ نہ ہوا وہ پتھر اور پتھر دل تھا[1] آخر میں وہ
لکھتے ہیں:[2]

"... و من پیر گمراہ در تیہ ناکامی متحیر گشتہ ام و نفسی دمی ماندہ، در زمان کہ وصف
مجلس مذکور می نوشتم خواستم کہ بیاد آں جوانان جاں نواز و آں مہ پیکران مایۂ
ناز کہ بعضی از ایشاں را و ناز و کرشمہ ایشاں را دیدہ بودم و سرود ایشاں شنیدہ
و پاکوفتن ایشاں مشاہدہ کردہ زنار بر بندم و ٹیکہ بر ہمناں در پیشانی لعنت خود کشم
و روی خود را سیاہ کنم و در تقریب و مصیبت آں شاہان جہان حسن و آں آفتابان
آسمان خوبی در کوچہ و بازار افتم و فضیحت و رسوا شوم و بعد شصت سال از فقدان
ایشاں نوحہ کناں و جامہ دراں و سر و ریش بروم و در زیر پای گور ایشاں جان دہم۔"

(ترجمہ) میں پیر گمراہ جو دشت ناکامی میں حیرت زدہ ہے اور صرف سانس اور جان
باقی ہے جس وقت مذکورہ مجلس کی تعریف میں قلم اٹھاتا ہوں تو چاہتا ہوں کہ ان
جوانان جاں نواز اور مہ پیکراں مایہ ناز کی یاد میں، جن میں بعض کو اور ان کے کرشمہ
و ناز کو دیکھ چکا ہوں، ان کے گانوں کو سن چکا ہوں، ان کے رقص کا مشاہدہ کر چکا
ہوں، زنار باندھ لوں اور اپنی پیشانی لعنت پر برہمنوں کا قشقہ لگا کر اپنا منھ کالا
کر لوں اور ان شاہان جہان حسن و آفتابان آسمان خوبی کہ مفارقت و مصیبت
میں خود کو کوچہ و بازار میں لے جا کر بدنام و رسوا کر لوں اور ساٹھ سال بعد ان کی
موت پر نوحہ خوانی اور جامہ دری کرتے ہوئے سر کے بل جاؤں اور ان کی قبروں کے

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۰۱-۱۹۹ [2] ایضاً ص ۲۰۰۔

مجھے اپنی جان دے دوں۔)

رنی کی عیش کوشیوں کی تفصیل انہیں کی زبان قلم سے اس لئے نقل کر دی گئی
ت مورخ ان کی نفسیات اور ذہنی کوائف کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ ان کی طبیعت میں
ندی نہیں تھی۔ جوانی کی بے اعتدالیوں اور امیرانہ عیش کوشیوں کے بعد جب وہ ناب
ن کا لازمی ردعمل یہ ہوا کہ ان پر مذہبی احساسات کا شدید غلبہ طاری ہو گیا۔ اس طر
رکوں کی زندگی میں پایا گیا ہے۔ وہ زندگی کے ایک سرے پر تو ترکوں کے حکمراں
کوشیوں میں شریک تھے لیکن بڑھاپے میں جب اس کا ردعمل ہوا تو دوسرے
آتے ہیں۔ اگر وہ اپنی تاریخ تائب ہونے سے کچھ پہلے لکھتے تو شاید ان کا لب و
اجوان کی تاریخ میں نظر آتا ہے۔ انہیں نہایت شدت کے ساتھ نیکی، راست بازی
ی کا احساس ہوتا ہے۔ یہی احساس انہیں تاریخ کا ایک واضح فلسفہ دریافت
ی رہنمائی کرتا ہے۔ وہ تاکید کرتے ہیں کہ راست بازی اور عدل و انصاف کی صا
کے بغیر نہ افراد کی نجات ممکن ہے اور نہ شاہی سلسلے خوش حالی اور کامرانی کے سا
د برقرار رکھ سکتے ہیں۔

طبیعت میں آرام طلبی اور تن آسانی تھی۔ خلجیوں کے عہد میں جب تک وہ فکر
ر تھے شاہی ملازمت یا ملکی سیاست میں حصہ لینے کے بجائے بے فکری اُ
ا بسر کرتے رہے۔ خلجیوں کے زوال کے بعد انہیں فکر معاش لاحق ہوئی۔
ق (۱۳۲۵/۲۵ء) کے دربار تک تو رسائی نہ ہو سکی۔ لیکن اپنے اوصاف و
وجہ سے محمد بن تغلق (۱۳۵۱/۵۲ء) کے ندیم اور معتمد خاص بن گئے۔ محمد بن
ں برنی کی وہی حیثیت تھی جو قاضی مغیث الدین کی سلطان علاء الدین

کے دربار میں تھی۔ دونوں بقول پروفیسر شیخ عبدالرشید اپنے اپنے آقاؤں کے وفادار اور بہی خواہ تھے اور دونوں اپنے اپنے آقاؤں کے سیاسی نظریات میں تبدیلی لانے میں ناکام رہے۔

محمد بن تغلق دنیا کے عجیب ترین بادشاہوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے متضاد اوصاف معاصرین اور مورخین دونوں کے لئے باعث حیرت ہیں۔ وہ اگر ایک طرف انتہائی رحم دل اور فیاض تھا تو دوسری طرف سفاکی اور خونریزی میں بھی آپ اپنی مثال تھا۔ درحقیقت وہ ان لوگوں میں تھا جو اپنے وقت سے آگے کی سوچتے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں کسی قسم کی رکاوٹ ان کی برداشت سے باہر ہوتی ہے۔ محدود فکر و نظر رکھنے والے انہیں سمجھ نہیں پاتے۔ وہ برنی پر بے انتہا مہربان تھا۔ سلطنت کے پیچیدہ مسائل پر ان سے مشورے کرتا تھا۔ برابر انعام و اکرام سے نوازتا رہتا تھا۔ اپنے حق میں اس کی فیاضیوں اور مہربانیوں کا برنی نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے[1]

"... من در دنیا پرورده و برآورده سلطان محمدام آنچه انعام اکرام او یافته بودم نه پیش ازاں دیده بودم نه بعد ازو بخواب می بینم۔"

(ترجمہ) میں دنیا میں سلطان محمد کا پروردہ اور برآوردہ ہوں جو کچھ انعام و اکرام میں نے اس سے پایا نہ تو اس سے پہلے اس کا تصور تھا اور نہ اس کے بعد خواب میں اس کا تصور کر سکوں گا۔"

وہ سترہ سال تین ماہ محمد بن تغلق کے ندیم اور معتمد خاص رہے[2] اس کے عہد کی تاریخ میں کئی جگہ اپنا ذکر کیا ہے۔ آخری زمانے میں جب سلطان ملک میں چاروں طرف پھیلی ہوئی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۶۷ [2] ایضاً۔

شوں اور بغاوتوں سے سخت متردد تھا تو دات کے پچھلے پہر اس نے برنی کو بلوایا اور
ے باغیوں اور سرکشوں کی سزا و عقوبت کے بارے میں مشورہ کیا۔ برنی نے کسی پرانی
کے حوالے سے جمشید کا فلسفہ تعزیر یہ بیان کیا کہ صرف سات طرح کے لوگوں پر بادشا
ست جائز ہے۔ ان میں پہلے تین کا تعلق ارتداد، قتل عمد اور بیوی کے ہوتے ہوئے
رنکاب سے تھا۔ بشرطیکہ ثبوت و شہادت موجود ہو۔ بقیہ چار حکومت اور حکمرانوں کے
اور سازشوں سے متعلق تھی۔ اس میں بھی شرط یہ تھی کہ دولت و حکومت کو خطرہ لاحق
تغلق برنی کی بات کو یہ کہہ کر ٹال گیا کہ یہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں، اب لوگ نہایت
نہ پرور اور مکار ہیں۔ ان کی خوں ریزی سے اس وقت تک باز نہ آؤں گا جب
ٹھیک نہ ہو جائیں یا میں خود ہی نہ رہوں۔ برنی نے اس سے کہا کہ سلاطین وزراء
ب اسی لئے کرتے ہیں کہ وہ قوانین وضع کر کے بادشاہ کو خوں ریزی سے باز رکھیں
شاہ نے یہ کہہ کر اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا کہ مجھے کوئی ایسا وزیر نہیں ملتا جو
ضع کرے۔[1]

ک موقع پر جب برنی امرائے سلطنت کی طرف سے دیوگیر کی فتح کی تہنیت لے کر
ے پاس پہنچے تو وہ بھروچ کی طرف جا رہا تھا۔ برنی ہم رکاب تھے۔ بادشاہ نے ان سے
یلی ہوئی بدامنی کو ختم کرنے کی تدبیر دریافت کی اور امیران صدہ اور طغی کی بغاوت
ہوئے کہا کہ اگر میں پہلے ہی انہیں قتل کرا دیتا تو یہ پریشانی نہ اٹھانی پڑتی۔ برنی کا
وہ جان کے خوف سے بادشاہ سے یہ نہ کہہ سکے کہ یہ سب کچھ اس کی سفاکیوں اور
ریزیوں کے سبب ہے۔[2]

وز شاہی ص ۵۰۹ تا ۵۱۷ ۲؎ ایضاً ص ۲۲-۵۲۱۔

بادشاہ کے آخری زمانے میں جب حسن گنگو نے دیوگیر پر قبضہ کر کے بہمنی سلطنت
کی بنیاد رکھی تو بادشاہ سخت فکرمند اور پریشان ہوا۔ اس نے ایک بار پھر برنی کو بلوایا
اور اس سے مشورہ کیا۔ اس بار برنی نے بلا جھجک اسے سلطنت سے دستکش ہو جانے کا
مشورہ دے دیا۔ کیونکہ ان کے خیال میں سلطنت کا موثر نظم و نسق محمد بن تغلق کے بس کا
کام نہیں تھا۔[1]

محمد بن تغلق پر شدید تنقید کے باوجود برنی کو اس کی ذات سے بے پناہ محبت تھی۔ ان کی
تنقید کے پیچھے دراصل ان کے نسلی تعصب کا جذبہ کارفرما تھا جو اس دور کی سماجی اور معاشرتی
زندگی کا مقتضی تھا۔ سلطان علاء الدین خلجی اور محمد بن تغلق دونوں نے حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر
تقرری کا معیار اہلیت و لیاقت کو بنایا تھا۔ اس میں اشراف و اخلاف کی قید و تفریق نہیں تھی
یہ تبدیلی اس دور کی سماجی اور معاشرتی اقدار و روایات کے خلاف تھی۔ اس نے برنی کو
علاء الدین اور محمد بن تغلق دونوں سے بدظن کر دیا تھا۔ انہوں نے دونوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا
لیکن جب ٹھٹھہ کے مقام پر کچھ دنوں بیمار رہ کر محمد بن تغلق چل بسا تو برنی پر رنج و الم کا پہاڑ ٹوٹ
پڑا وہ خون کے آنسو روئے اور نہایت دلگداز مرثیہ لکھا۔[2]

"....آں جہاں پناہ و جہانگیر از تختگاہ بادشاہ درمیان تختہ چوب خفت و از مسند اولوالامری
اسیر خاک شد۔

سر الپ ارسلاں بینی ز رفعت رفتہ از گردوں ——— بمرو آ تا بخاک اندر تن الپ ارسلاں بینی
امیرانی بر قصرش ہزاراں پاسباں بودی ——— کنوں بر قبرہ گورش کلاغاں پاسباں بینی

"ای! داد از چرخ بی وفا و قرار از روزگار پر جفا کہ شاہان جہاں پناہ و جہانبانان انجم

۱؎ تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۲-۵۲۱ ۲؎ ایضاً ص ۲۶-۵۲۵۔

سپاہ را برخاک مذلت میان چارگز گوری روا می دا دسلطان شرق وغرب را بزیر
زحمت خواری می پسندد۔"

مایہ زہر ست شرب عالم را	میوہ مرگست تخم آدم را
ای حریف ہمسرم قدم را بہ	کم زن این عالم از قدم کم را
صبح محشر دمید وما درخواب	بانگ زن خفتگان عالم را
ہاں کہ فرش فنا بگسترند	درنورد این بساط خرم را
دستخیز ست خیز باز شگاف	سقف ایوان وطاق طارم را
شد محمد، بخفت در دل خاک	نیلگوں کن لباس ماتم را
پس بدست خروش بر تن دہر	خاک زن این قبای معلم را

سلطان محمد بن تغلق کے اولاد نرینہ نہ تھی۔اس کے وزیر احمد ایاز نے ایک چھ[…]
[…]ے لڑکے کو سلطان کا بیٹا بنا کر تخت پر بٹھا دیا تھا۔لیکن امراء واہل لشکر سلطان
[…]ئی فیروز شاہ تغلق (۷۵۲/۱۳۵۱) کو اس کا جانشین تسلیم کر چکے تھے۔مقابلے میں
[…]ز کو شکست ہوئی وہ مارا گیا۔فیروز شاہ تغلق تخت نشین ہوا۔تخت نشینی سے قبل برنی
[…]کے تعلقات بہت اچھے تھے۔چونکہ احمد ایاز محمد بن تغلق کا وزیر تھا۔اس سے
[…]تعلقات زیادہ تھے۔حاسدوں نے اس کو ان کے خلاف استعمال کیا اور
[…]اہ کو برنی کی طرف سے بدظن کر دیا۔برنی نے لاکھ خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی
[…]ں کی۔فیروز شاہ کی رنجش دور نہیں ہوئی۔انہوں نے اس خوشامد میں اپنی
[…]ذا تصنیف "تاریخ فیروز شاہی" اس کے نام سے موسوم کی۔لیکن اس کا دل
[…]رف سے صاف نہیں ہوا۔برنی کو اس کا بڑا قلق تھا۔[1]

[…]وز شاہی، ص ۲۷-۵۲۵۔

"۔۔۔۔۔ چہ کنم دشمنانم از حضرت واز قرب او مرا دور انداختہ اند میسرم نمیشود
کہ این تاریخ را در نظر ہمایون او بگذارم۔"

وہ دعا کرتے ہیں کہ کسی طرح ان کی تاریخ سلطان کی نظر سے گذر جائے۔لیکن ان کی
حسرت پوری نہ ہو سکی۔[1]

"۔۔۔۔۔ بغایت شکستہ ام واین شکستگی در حضرت بی نیازی مناجات میکنم ومیگویم
الٰہی بحرمت شکستگی خاطر من وبحرمت وبیچارگی ومسکنت حال من لطیفہ ساز
کہ این تاریخ من در نظر خداوند عالم، بادشاہ بنی آدم فیروز شاہ السلطان
خلد اللہ ملکہ وسلطانہ بگذرد۔"

ملک الامراء سلطانی جو فیروز شاہ کے بندگان خاص میں تھا۔برنی کے حق میں
بادشاہ سے سفارش بھی کی مگر وہ بدستور معتوب سلطانی رہے۔ان کی زندگی کے
آخری ایام تنہائی، کس مپرسی اور گمنامی میں گزرے۔چونکہ وہ انتہائی سیر چشم اور فیاض تھے
برے دنوں کے لئے دولت جمع کرنے کا خیال نہیں آیا۔ان کا آخری زمانہ عسرت،
تنگدستی اور ناداری میں گزرا خود لکھتے ہیں۔[2]

"بڑی سختی جھیل رہا ہوں۔درماندہ اور عاجز ہوں، مانگنے والے میرے دروازے
سے محروم جاتے ہیں۔۔۔۔میرے پاس نہ کچھ متاع ہے نہ مجھے کوئی قرض دیتا ہے۔"

اسی افلاس وناداری کے عالم میں انہوں نے اپنی شاہکار کتاب "تاریخ فیروز شاہی"
مکمل کی تھی۔اس کی تکمیل ۷۶۰/۱۳۵۸ میں ہوئی تھی۔اس وقت برنی کی عمر چوہتر
(۷۴) سال ہو چکی تھی۔وہ زیادہ دنوں زندہ نہیں رہے۔ان کی وفات اسی سن کے

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۳۵ [2] ایضاً ص ۱۲۵۔

آس پاس میں قیاس کرنا چاہئے۔ مرنے سے پہلے جسم کے کپڑے بھی خیرات کر دئے تھے۔ لاش جس بوریے پر سوتے تھے اسی میں لپیٹ کر خریطۂ سلطان المشائخ کے جوار میں دفن کر دی گئی۔ کتبہ نہ ہونے کی وجہ سے قبر کا نشان بھی مٹ گیا۔[1]

برنی کی دیگر تصانیف میں "ثنای محمدی"، "صلوٰۃ کبریٰ"، "عنایت نامہ"، "تاثیر سعادت" اور "برمکیوں کی داستان" کا ذکر "سیر الاولیاء" میں ملتا ہے۔ "حسرت نامہ" کا ذکر مع اس کے اقتباس کے "اخبار الاخیار" اور "سواطع الالہامہ" میں ہے لیکن "تاریخ فیروز شاہی" کے بعد برنی کی جس کتاب کو زیادہ شہرت ملی وہ "فتاویٰ جہانداری" ہے۔

برنی کو ان کی جس تصنیف نے بقائے دوام عطا کیا وہ "تاریخ فیروز شاہی" ہے جو سلطان غیاث الدین بلبن سے لے کر فیروز شاہ تغلق کے ابتدائی چھ سالہ عہد تک کی نہایت معتبر و مستند تاریخ ہے۔

برنی اگرچہ خود امور سلطنت اور ملکی سیاست سے علیحدہ تھے لیکن اپنے زمانے کے امراء، وزراء، اشراف اور دانشمندوں سے روز کا ملنا جلنا اور ان کی صحبتوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ وہ ملک کے تاریخی حالات اور اہم سیاسی واقعات سے بخوبی واقف تھے۔ ان پر ان کی گہری نظر تھی۔ انہوں نے لوگوں کے حالات کا حقیقت شناس نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ انہیں قرطاس و قلم کی زینت بنا کر تاریخ کے صفحات میں محفوظ کر دیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ اس تاریخ کی تصنیف میں انہیں بڑی زحمتیں اٹھانی پڑی ہیں۔ اپنی تاریخ کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ یہ بہت سے تاریخی امور پر حاوی ہے۔ اس میں بادشاہوں کے تاریخی حالات، سلطنت کے انتظام احکامات کے بارے میں معلومات اور سلاطین کے لئے پند و نصائح اور ہدایات دوسری کتابوں سے بہتر ملیں گی۔ ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ان کی کتاب صحیح اور معتبر ہے ان کا طرز تحریر قابل تقلید ہے۔ کیونکہ کم سے کم لفظ میں زیادہ سے زیادہ معنی جمع کر دئے گئے ہیں۔[2]

گر بگویم کہ نیست در عالم — قبل تاریخ من کتاب دگر
چوں دریں علم عالمی نبود — کہ کند گفتۂ مرا باور

(باقی)

[1] سیر الاولیاء ص ۳۱۳: "آخر الامر چند روز زحمت شدہ از دنیا بدار البقی مردانہ و عاشقانہ خرامید۔ وقت نقل دانگ درم نداشت بلکہ جامہ ہای تن نیز بداد و در جنازہ فرو و بالای او ادیک توکی بوریا بود"۔ [2] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۵-۱۶۔

شیخ محمد بن عیسیٰ جون پوری کی تاریخ ولادت

از جناب عبدالقدوس رومی مچھلی شہری ٭

آٹھویں نویں صدی ہجری (۱۴ ویں، ۱۵ ویں صدی عیسوی) سے تعلق رکھنے والے ایک بزرگ مخدوم العارفین شیخ محمد بن عیسیٰ کے نام سے مشہور و معروف گزرے ہیں جن کی ولدیت جملہ تذکرہ نگاروں نے عیسیٰ لکھی ہے۔ تذکروں میں جگہ پاکر بطور یادگار محفوظ ہو جانے والے افراد نے مختلف وجوہ سے ان میں جگہ پانے کا حق حاصل کیا ہے۔

بیشتر حضرات تو وہ ہیں جنھیں ان کے ذاتی کمالات کی وجہ سے ہی اتنی شہرت مل گئی کہ تذکرہ نگار حضرات انہیں نظر انداز کر ہی نہ سکے اور مجبور ہو گئے کہ ان کے "تذکرہ" سے اپنی تصنیف کے صفحات کو مزین و متبرک کریں۔ اس قسم کے مشاہیر و اکابر میں بعض حضرات اس درجہ ممتاز و عالی مقام تھے کہ تذکرہ نگاروں نے تنہا صرف انہیں کا مستقل تذکرہ لکھنا ضروری سمجھا۔

تذکروں کے مطالعہ سے معاملہ کا یہ پہلو بھی سامنے آیا ہے کہ کسی غیر معروف بزرگ کا مختصر سا تذکرہ صرف اس پہلو سے کتب تذکرہ میں آگیا ہے کہ وہ غیر معروف بزرگ کسی معروف و مشہور

٭ مفتی شہر جامع جہاں آرا۔ گھر

ں کے والد محترم ہیں یا ان کے محترم استاد ہیں۔

اور کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی بزرگ کا اصل خاندانی اور گھریلو نام کچھ اور تھا
حلقوں میں وہ اپنے کسی لقب سے متعارف تھے جس کی وجہ سے تذکرہ نگار حضرات
اس علمی لقب ہی سے واقف ہو سکے اور اسی لقب سے ان کا تذکرہ لکھا گیا نتیجہ یہ
ے ان کا صرف خاندانی ہی نام معلوم ہوا وہ ان کا ذکر کتب تذکرہ میں ڈھونڈتا ہی
ر اپنی جستجو و تلاش میں ناکام ہوتا رہا۔

مخدوم شیخ محمد بن عیسیٰ راقم السطور کے اجداد اور ہندوستانی سکونت رکھنے والے
ور شان اعلیٰ میں شمار ہوتے ہیں۔

مارے خاندانی شجرہ نگار ایک بزرگ جو راقم سے چار پشت اوپر پانچویں نمبر پر
نہوں نے اپنا خاندانی شجرہ اور خاندانی رشتہ داریوں کی تفصیلات پر مشتمل ایک
" نسب نامہ صدیقیان" کے عنوان سے مرتب کی تھی جو گھر میں محفوظ چلی آرہی تھی،
فارسی میں تھی اس لئے حضرت والد محترم مولانا محمد سراج الحق صاحب نے اس میں
کے اضافے کئے ایک تو بیاض کے ہر صفحہ کے ساتھ ایک سادہ کاغذ لگا کر اس پر
رجات کا اردو میں ترجمہ کر دیا دوسرے فارسی کی مسلسل عبارت میں شجرے کے جن
ر تھا ان ناموں کو علیحدہ علیحدہ دائروں میں لکھ کر انہیں نمایاں کر دیا۔

ر سال پہلے جب احقر نے کچھ ضرورت محسوس کی کہ قلمی بیاض کے مندرجات کی مزید
تحقیق اگر دوسری کتب تذکرہ سے بھی ہو جائے تو ایک اچھا کام ہوگا۔
خیال نے کچھ دنوں میں ایک خبط اور دھن کی شکل اختیار کر لی اور اس دور کے
ذکروں سے مراجعت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے

تذکرہ "اخبار الاخیار" کا نام کانوں میں پڑ چکا تھا جو اپنی ادبی بلاغت کی وجہ سے موجب دلکشی
بھی تھا اور آگرہ کی ایک مشہور علمی و ادبی اور خاندانی شخصیت جناب سید محمد علی شاہ میکش اکبرآبادی
کے کتب خانہ سے عاریۃً مطالعہ کے لئے مل بھی گیا۔

"اخبار الاخیار" کے مطالعہ سے اس بات کی تو تصدیق ہو گئی کہ شہر جونپور میں سلاطین
شرقی کے دور میں ایک بزرگ "شیخ محمد عیسیٰ" گذرے ہیں جن کے متعلق صاحب "اخبار الاخیار"
کے جستہ جستہ فقرے ملاحظہ ہوں:-

(۱) محمد عیسیٰ از کبار مشائخ جونپور است ـــــــ و از صادقان راہ خدا است
ـــــــ والد او شیخ احمد عیسیٰ از اکابر دہلی است در فراقے (در قزاقی ہو سکتا ہے)
کہ از آمدن امیر تیمور بصوب دہلی افتا اکثرے از اکابر بجانب جونپور رفتند و او نیز در آں
میان بود و شیخ محمد عیسیٰ دراں زمان ہفت و ہشت سالہ بود، و ہم در صغر سنی بمقتضائے
سعادت ازلی و استعداد جبلی مرید شیخ فتح اللہ شد و با وجود آں باشارت پیر مدتے بہ پیش ملک العلما
قاضی شہاب الدین تلمذ کرد، و شرح اصول بزدوی کہ قاضی تا بحث امر دار د بہ تقریب او نوشتہ
است (اخبار الاخیار ص۱۸۶ کا مختصر اقتباس بحوالہ اقتباسات مرسلہ کہ از قاضی اطہر مبارکپوری
براقم السطور)

اب چند اور دوسرے تذکروں کے بھی اقتباسات اختصار کے ساتھ ملاحظہ فرمائے جائیں۔

(۲) شیخ عبدالصمد بن افضل محمد بن یوسف اکبرآبادی اپنے قلمی مخطوطہ اخبار الاصفیا میں
لکھتے ہیں:

"شیخ محمد بن عیسیٰ قدس اللہ اسرارہما انوار الٰہی از لوحۂ جبینش می تابید ـــــــ
از اعاظم مشائخ جونپور است در زمانے کہ صاحبقران (امیر تیمور) بہ ہندوستان چالش

فرمود پدر او در ہفت سالگی از دہلی کہ وطن گاہ او بود بجونپور آوردہ توطن اختیار کرد

و دراں صغر سن کہ عنوان صحیفہ جوانی و عنفوان عقل ہیولانی بودہ منظور نظر شیخ

فتح اللہ اودھی شد و باشارہ او علوم ظاہری از درسگاہ ملک العلماء قاضی شہاب الدین

دولت آبادی اندوختہ و بہ تصفیہ باطن کمر سعی بر میاں بست۔" (اخبار الاصفیاء

ورق ۰۷ بحوالہ اقتباسات مرسلہ قاضی اطہر مبارکپوری بہ راقم سطور)

(۳) سید علی موسوی حیدرآبادی کے قلمی مخطوطہ مشکوٰۃ النبوہ کے بھی ضروری اقتباسات

درج کئے جاتے ہیں:۔

ذکر شریف آں خانہ عشق را سراج آں کاشف سر معراج، مخدوم وقت شیخ محمد بن

[عی]سیٰ تاج است رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ وے از کبار مشائخ جونپور است سلسلۂ نسب او

[ح]ضرت خیر الرفیق ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ می رسد، بغایت عالی شان بود ــــــ

ولایت و کرامت او ہمہ اہل اللہ متفق اند ــــــ صاحب اخبار الاخیار کہ پدر

[ش]یخ عیسیٰ تاج از اکابر شہر دہلی بود، از آمدن امیر تیمور اکثر اکابر بجانب جونپور

[آم]ند او نیز دراں میاں بود، شیخ محمد دراں زماں بعمر ہشت سالگی ہمراہ پدر برآمد، در

[صغر] سن مرید شیخ فتح اللہ اودھی شد بعد از تحصیل علوم ظاہری در خدمت شیخ فتح اللہ

[بتص]فیہ باطن مشغول شد، ــــــ مرقد وے در شہر جونپور و فاتش بہ نظر نیامدہ و

[...] معاصر سلطان ابراہیم شرقی بادشاہ جونپور بود رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ" (مشکوٰۃ

[النبو]ہ، ورق ص۹۱ و ص۹۲)

[(۴)] تذکرہ علمائے ہند کے مولف رحمان علی لکھتے ہیں:

محمد عیسیٰ ابن شیخ احمد عیسیٰ دہلوی در قرآتیکہ (غالباً یہ لفظ "در قرا تیکہ" ہوگا)

از آمدن امیر تیمور بصوب دہلی افتاد اکثرے اکابر بجونپور و فتند شیخ احمد عیسیٰ نیز دراں

میاں بود و محمد عیسیٰ دراں زماں ہفت ہشت سالہ بود دہم در صغر سن بمقتضائے

سعادت ازلی و استعداد جبلی مرید شیخ فتح اللہ اودھی شد۔" (تذکرہ علمائے ہند رحمٰن

علی ص ۲۰۵)

یہ چاروں ہی تذکرے تقریباً ایک ہی مفہوم کو معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ ادا کر رہے

ہیں، صاحب تذکرہ علمائے ہند نے تو تقریباً اخبار الاخیار ہی کے الفاظ کو نقل کر دیا ہے۔

اخبار الاصفیا اور مشکوٰۃ النبوۃ کے مولفین نے اپنے انشائی اسلوب میں بات وہی کہی

ہے مگر الفاظ اور اسلوب اپنا رکھا ہے۔

لیکن شیخ محمد کی تاریخ ولادت کسی نے بھی نہیں بیان کی، تاہم اس پر سب متفق ہیں کہ

آمد تیمور کے وقت ملک میں جو لوٹ مار اور افراتفری مچی تھی اسی کے نتیجہ میں شیخ محمد کے والد

بھی دوسرے اکابر دہلی کے ساتھ جونپور تشریف لائے تھے اور شیخ محمد کی عمر اس وقت

سات آٹھ سال کی تھی اور اسی عمر میں (جب کہ بچپن کا زمانہ بھی ختم نہ ہوا ہوگا) انہوں نے

پہلے تو شیخ فتح اللہ اودھی سے بیعت کی اور پھر انہیں کے اشارہ پر ملک العلماء قاضی شہاب الدین

دولت آبادی کا تلمذ اختیار کیا اور ان سے اصول بزدوی پڑھی اسی تقریب سے قاضی شہاب الدین

نے ان کے لئے اصول بزدوی کی بحث امر تک شرح بھی لکھی تھی۔

ظاہر ہے کہ چھ سات سال کی عمر میں شیخ محمد کی شیخ فتح اللہ اودھی سے بیعت ارادت اور

پھر انہیں کے حکم سے تعلیم کا آغاز اور اصول بزدوی تک تعلیم کی انتہا۔ یہ سب ایسی محیر العقول

اور ناقابل یقین باتیں ہیں جن کو باور کرنا مشکل ہے۔

(۵) نزہۃ الخواطر (جس کا تبدیل شدہ نام "الاعلام" ہے) میں مولانا عبدالحئی الحسنی

الرحمہ نے حضرت شیخ محمد کے حالات یوں لکھے ہیں :

" الشیخ محمد بن عیسیٰ الجونپوری۔ الشیخ الامام العالم الکبیر العلامۃ محمد بن عیسیٰ بن تاج الدین بن بہاؤ الدین الحنفی الصوفی الجونپوری کان من نسل محمد بن ابی بکر الصدیق کما فی منہج الانساب ولد بدار الملک دھلی فی سفر سنۃ ثمانین و سبعمائۃ (۷۸۰ھ) وخرج منہا والدہٗ معہٗ فی الفتنۃ التیموریۃ فدخل جونپور وقرأ علی القاضی شہاب الدین الدولۃ آبادی وکان القاضی یحبہ حبًا مفرطاً صنف لہ شرحاً علی اصول البزدوی الی مبحث الامر عند قراءتہ ذالک الکتاب علیہ، ولما قرأ محمد فاتحۃ الفراغ علیہ درس وافاد زمانا طویلا ثم ترک البحث والاشتغال واخذ الطریقۃ عن الشیخ فتح اللّٰہ الاودی وجاھد فی اللّٰہ حق جہادہٖ حتی قیل ان ظہرہٗ لم یمس الارض اثنتی عشرۃ سنۃ، ـــ الیٰ ان قال وکانت وفاتہ فی الرابع عشر ربیع الاول سنۃ سبعین وثمان مأیۃ" (۸۷۰ھ) (الاعلام ج ۳ ص ۱۱۱)

الاعلام کے مصنف علام نے اگرچہ شیخ محمد کے سن ولادت کی تصریح کر دی ہے کہ ۷۸۰ھ میں بمقام دہلی پیدا ہوئے تھے اور فتنہ تیمور میں (جو باتفاق مورخین ۸۰۱ھ واقع تھا)، دہلی سے جونپور اپنے والد صاحب کی معیت میں آگئے تھے اور جونپور آنے کے انہوں نے قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے پہلے علوم ظاہری کی تکمیل کی اور بعد ایک طویل زمانہ تک درس و تدریس میں مشغول رہے اس کے بعد شیخ فتح اللہ اودھی علوم باطنی حاصل کئے اور سلوک کی تکمیل کی۔

صاحب اعلام کی اس تفصیل کو صحیح مانا جائے تو یہ صورت سامنے آتی ہے کہ شیخ محمد جن کی ولادت ۷۸۰ھ میں ہو چکی تھی وہ بیس سال تک یوں ہی علوم ظاہری و علوم باطنی سے بالکل ہی بے بہرہ رہے اور ۸۰۱ھ میں جب فتنۂ تیموریہ نے انہیں دہلی چھوڑنے پر مجبور کر دیا تو جون پور پہنچ کر ۸۰۲ھ میں تعلیم حاصل کی اور پھر کافی زمانے کے بعد شیخ فتح اللہ اودھی سے وابستہ ہوئے جب کہ خود صاحب اعلام ہی نے شیخ فتح اللہ اودھی کی وفات ۸۲۱ھ میں بتائی ہے اور حضرت شیخ اودھی کے جو حالات کتابوں میں جستہ جستہ ملتے ہیں ان کو دیکھا جائے تو اندازہ یہی ہوتا ہے کہ چونکہ ان کے شیخ احمد بن شہاب صدر الدین الحکیم دہلی ہی کے رہنے والے تھے اس لئے شیخ فتح اللہ اودھی کی عمر کا بڑا حصہ دہلی میں گزرا ہے، دہلی ہی کی جامع مسجد میں مدت دراز تک ان کی مسند تدریس بچھی لگی ہوئی تھی اور فتنۂ تیمور سے پہلے قاضی شہاب الدین دولت آبادی اپنے استاذ قاضی عبد المقتدر کی زندگی ہی میں اپنی تدریسی صلاحیت میں شہرت پا چکے تھے۔

ایسی صورت میں مذکورہ بالا تذکروں کی دونوں ہی باتیں نا قابل قبول ٹھہرتی ہیں یعنی نہ تو شیخ محمد کی عمر فتنۂ تیمور کے وقت سات آٹھ سال مانی جا سکتی ہے جیسا کہ اوپر کے چار تذکروں سے ظاہر ہوتا ہے اور نہ ہی یہ بات قرین قیاس و قابل قبول ہے کہ ۷۸۰ھ میں پیدا ہونے والے شیخ محمد بیس اکیس سال تک تعلیم و تعلم اور سلوک و تصوف سے بالکل ہی نابلد رہے۔

ہمارے گھر میں جو خاندانی شجرہ " نسب نامۂ صدیقیان " کے عنوان سے علمی شکل میں موجود ہے اور جس کا ذکر اوپر آ بھی چکا ہے۔ اس تذکرہ میں حضرت شیخ محمد بن عیسیٰ کا سال ولادت تو مذکور نہیں ہے لیکن اس کی مندرجۂ ذیل روایت سے ان کی عمر کا

ذہ ضرور لگایا جاسکتا ہے کہ دہلی سے جونپور جانے کے وقت ان کی عمر کتنی رہی ہوگی،
مجد لکھتے ہیں:

"جب حضرت مخدوم (یعنی شیخ محمد کے والد مخدوم شیخ عیسیٰ) دہلی سے باہر نکل آئے اور قصبہ کرسی میں پہنچے ان کے ساتھ دونوں فرزند محمود احمد یعنی ایک تو تاج العارفین خواجہ محمد عیسیٰ دوم احمد عیسیٰ بھی تھے۔

قاضی شہر (کرسی) نے اپنی لڑکی کے ساتھ رشتہ کی تحریک کی مخدوم (خواجہ عیسیٰ) نے فرمایا: شیخ کے ساتھ (یعنی بڑے صاحبزادے کے ساتھ) نسبت بہتر ہے (قاضی شہر کے گھر کی) عورتوں نے کہا ان کی عمر زیادہ ہے، مخدوم (خواجہ عیسیٰ) نے فرمایا کہ تم سب بے عقل ہو اور بے عقلی کی وجہ سے فقیر ہو گئے ہو جو میں کہتا ہوں وہی کرو ـــــ پھر آپ نے وہاں سے آکر جونپور میں قیام اختیار فرمالیا۔" (خاندانی بیاض نسب نامہ صدیقیان)

حکایت مذکورہ سے دو باتیں بالکل صاف سمجھ میں آرہی ہیں کہ اس وقت دونوں ہی
ںوں (محمود احمد) کی عمر شادی کے لائق ہو چکی تھی اور عورتوں کے تامل و انکار سے یہ بات
ظاہر ہوتی ہے کہ چونکہ اس دور کی شادیاں عام طور پر کم عمری ہی میں ہوجایا کرتی تھیں
لئے عورتوں کو شیخ محمد کی عمر اس رواجی عمر سے کچھ زیادہ ہی لگی اس لئے انہیں تامل ہوا
رشتہ نہ ہو سکا۔

اس حکایت میں اگرچہ حضرت شیخ محمد کا سن ولادت مذکور نہیں ہے لیکن اس سے
عمر کا اندازہ بہرحال ہوجاتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر بیس سال سے یقیناً زیادہ رہا
اس اندازہ کے مطابق الاعلام کا بیان کردہ سن ولادت درست معلوم ہوتا ہے او

اوپر کے ہر چہار تذکرہ میں بیان کی ہوئی عمر ناقابل یقین ٹھہرتی ہے اور اعلام کے بیان سے ان کا سن ولادت تو ضرور معلوم ہوجاتا ہے لیکن بیس اکیس سال کی عمر تک ان کی فارغ تحصیلی ناقابلِ فہم قرار پاتی ہے۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا کہ حضرت شیخ محمد جونپوری کو اپنے شیخ فتح اللہ اودھی سے ربط وعقیدت بھی قیام دہلی ہی کے زمانے میں ہوچکی تھی اور اپنے استاذ قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے تلمذ و تعلم کے مواقع بھی انہیں اس وقت حاصل ہوچکے تھے۔

اس حقیقت کے ساتھ اگر اس حقیقت کا بھی اضافہ کرلیا جائے کہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی اور شیخ محمد کے پدر بزرگوار عیسیٰ (جو علمی حلقوں میں قاضی نصیر الدین جونپوری کے لقب سے معروف و مشہور ہوئے) دونوں ہی بزرگ قاضی عبد المقتدر الکندی کے مخصوص تلامذہ میں تھے جس کی وجہ سے شیخ محمد کی قاضی شہاب الدین تک باریابی کچھ مشکل نہ رہی ہوگی اور چونکہ قاضی نصیر الدین عیسیٰ حضرت مخدوم جہانیاں کے خلیفہ و مجاز بھی تھے۔ اس کوچۂ سلوک کی رہ نوردی اور شیخ فتح اللہ اودھی کی منزل عرفان تک ان کی رسائی بھی کچھ دشوار نہیں تھی۔

اور منبع الانساب (جس کے مولف حضرت مخدوم شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری سے بیعت واجازت بھی رکھتے ہیں) کے بیان کے مطابق حضرت شیخ محمد خود اپنے پدر بزرگوار حضرت مخدوم عیسیٰ نصیر الدین قاضی جونپوری سے بھی تربیت سلوک حاصل کئے ہوئے تھے۔

ت

قتیل شفائی کی رحلت

...ـ زیب خاں قتیل شفائی کی وفات سے اردو کے شعری و ادبی حلقے میں بڑا خلا
...ده ۲۴ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو ہری پور ضلع ہزارہ پنجاب (پاکستان) میں پیدا ہوئے ابتدائی
...ائی اسکول میں ہوئی، ۳۲ء سے شعر کہنے لگے، راولپنڈی وغیرہ کے مشاعروں میں
...غزلیں پڑھتے تو سماں بندھ جاتا، کلام کی خوبی و دلکشی اور جادو بھری آواز
...ت پیدا کردیتے تھے، اس لئے دوسری جگہوں کے مشاعروں میں بھی بلائے جاتے۔
...وہ ہری پور میونسپلٹی میں ملازم رہے پہلی مرتبہ لاہور کے مشاعرے میں شرکت
...ں کے مشہور ادبی مجلے "ادب لطیف" میں ان کا کلام پہلے سے شائع ہوکر
...خراج تحسین وصول کرنے لگا تھا، لاہور آنے پر جب "ادب لطیف" کے دفتر
...زیر احمد نے اس کی ادارت کی پیش کش کی، لاہور میں ان کا تعلق فلمی دنیا سے
...ں شہرت حاصل کی، تاہم اس سے ادبی حلقوں میں ان کی پذیرائی میں کمی نہیں ہوئی
...ائب و محاسن میں قتیل شفائی کی گہری نظر تھی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی روایت
...مشاعرے میں جوش ملیح آبادی صاحب نے اپنی نظم میں ایک مصرع پڑھا
...ی گلبدنی ہے تو قتیل نے مصرع کو غلط بتایا، آزاد صاحب نے وجہ پوچھی تو
...د "گلبدنی" سے پہلے "کیا" آنا چاہئے اور جرأت کا مصرعہ پڑھا

ع کیا بات ہے، کیا بات ہے، کیا بات ہے واللہ

ایک بار جگن ناتھ آزاد نے ان کو اپنی ایک غزل سنائی جس کا یہ شعر قتیل کو بہت پسند آیا ؎

تہذیبِ کہنہ میری شرافت پہ ناز کر — دھوکا دیا ہے دوست نے شرما رہا ہوں میں

کچھ مدت کے بعد آزاد صاحب کو جوش ملیح آبادی مرحوم کے کسی مجموعہ کلام میں یہ شعر نظر آیا

کوئی حد ہے آخر احترام آدمیت کی — بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

ملاقات ہونے پر آزاد صاحب نے جب قتیل سے کہا کہ جوش صاحب کے یہاں اسی مضمون کا شعر موجود ہے تو انہوں نے کہا نہیں تمہارا شعر مختلف ہے، جوش نے دشمن کی بات کی، تم نے دوست کا ذکر کیا، ان کے کہنے سے آزاد صاحب نے اپنی غزل سے یہ شعر خارج نہیں کیا۔

نظموں اور غزلوں کے علاوہ مثنوی اور گیت بھی کہتے تھے اور ان سب کے متعدد مجموعے شائع ہوئے، پہلا مجموعہ "مغرب زدہ" ۱۹۴۲ء میں چھپا جو مثنوی ہے، کلیات تین جلدوں میں رنگ، خوشبو اور روشنی کے نام سے شائع ہوا، ان کے کلام کا انتخاب بھی شائع ہوچکا ہے۔

قتیل شفائی کی مقبولیت اس سے ظاہر ہے کہ ان کی زندگی ہی میں بعض ادبی رسالوں نے ان پر خاص نمبر شائع کئے اور مختلف ملکوں میں ان کا جشن منایا گیا اور حکومت پاکستان نے "تمغۂ حسن کارکردگی" دے کر ان کی قدردانی اور عزت افزائی کی۔

قتیل نے افسانے بھی لکھے جو "ساقی" وغیرہ میں شائع ہوئے "ادب لطیف" کے علاوہ بعض دوسرے ادبی رسالوں کی ادارت بھی کی، لاہور ان کا وطن ثانی تھا اور یہی ان کا مدفن بھی بنا، ۱۱ر جولائی کو طویل علالت کے بعد انتقال کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے دامنِ عفو میں جگہ دے آمین!!

بیگم قدسیہ اعزاز رسول کی وفات

یہ خبر رنج و غم کے ساتھ سنی جائے گی کہ یکم اگست کو بیگم قدسیہ اعزاز رسول کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کا آبائی وطن مالیر کوٹلہ تھا، ان کے والد یہاں کے معزز اور بڑے بااثر

شخص تھے، ان کی شادی نواب اعزاز رسول سے ہوئی جو سندیلہ کے بڑے تعلقہ دار تھے۔

بیگم صاحبہ کی زندگی قومی، سیاسی، سماجی اور تعلیمی سرگرمیوں کے لئے وقف رہی۔ آزادی سے پہلے وہ اور ان کے شوہر مسلم لیگ سے وابستہ رہے، نواب صاحب یو۔ پی مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری تھے جن کا کئی برس پہلے ہی انتقال ہوچکا ہے۔

بیگم قدسیہ کا شمار کانگریس کے سرکردہ لوگوں میں ہوتا ہے، وہ ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کی رکن تھیں اور اب اس کی یہی ایک ممبر رہ گئی تھیں، ان کی وفات سے یہ یادگار بھی ختم ہوگئی۔

وہ عبوری پارلیمنٹ اور راجیہ سبھا کی رکن رہیں اور کئی بار سندیلہ اسمبلی حلقے سے کانگریس کے ٹکٹ پر یو۔ پی اسمبلی کی ممبر منتخب ہوئیں اور وزیر بھی مقرر کی گئیں۔

بیگم صاحبہ اترپردیش اقلیتی کمیشن کی چیرمین اور برسوں آل انڈیا ویمنس ہائی ایسوسی ایشن کی صدر رہیں، انہوں نے سندیلہ اور لکھنؤ کے کئی علمی و تعلیمی اداروں کی سرپرستی اور نگرانی بھی کی۔

وہ قدیم تہذیب و شرافت کا نمونہ اور قوم و ملت کی پرانی روایات و اقدار کی حامل تھیں ب قومی رہنماؤں میں بہت کم لوگ ہی ایسے رہ گئے ہیں۔ دارالمصنفین سے بھی لگاؤ تھا، اقلیتی شن کے سربراہ کی حیثیت سے اعظم گڈھ تشریف لائیں تو یہیں اس کی میٹنگ رکھی اور تی نمائندوں سے تبادلۂ خیال کیا۔ اللہ تعالیٰ عالم آخرت میں قوم و ملک کی اس خدمت گزار درجات بلند کرے آمین!!

"ض"

آثار علمیہ و تاریخیہ

مکتوب بنام مولانا سید سلیمان ندویؒ

ادارہ مراسلات تعلیمی، وزارت تعلیم بہاولپور

۱۷ ذی القعدہ ۵۷ھ ۲۷ء

بخدمت شریف حضرت مولانا صاحب دامت عنایاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج گرامی۔

۱۔ نصاب ہمارا انگریزی ترجمہ ہوچکا ہے۔ واقعی اچھی چیز ہے لیکن افسوس کے ساتھ اظہار کرنا پڑتا ہے کہ تعلیمی ہدایات و متعلقہ خصوصیات کا ذکر اس میں نہیں ہے۔ لہٰذا جناب کے ارشاد کے موافق میں نے دوبارہ خط مولانا الحاج معین الدین صاحب پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کی خدمت میں روانہ کردیا ہے۔ امید ہے کہ جناب والا بھی مزید توجہ دہانی فرمائیں گے اور ان کی طرف تحریر فرمائیں گے کہ مدارس عربیہ کی تمام تر خصوصیات انتظامی وغیرہ جن کے متعلق میں نے ان سے دریافت کیا ہے۔ قید تحریر میں لاکر بہت جلد ممنون کریں گے۔ میں نے پہلے محکمہ پبلک انسٹرکشن بہار سے بھی جناب پرنسپل صاحب کے اشارہ پہ کی تھی۔

۲۔ ہمیں اس نصاب کی وجہ سے ایک نئی چیز پیش آئی ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے وزیر صاحب اس نصاب کے دیکھنے کے فوراً بعد تیار ہوگئے۔ ہم بھی معیار تعلیم بلند کرکے پٹنہ یونیورسٹی کی طرح پنجاب یونیورسٹی سے اپنے ہاں کے مدارس عربیہ کا نصاب ان کے منظور شدہ امتحانات کے درجہ پر تسلیم کرانے کی کوشش کریں تاکہ ہمارے ہاں کے تعلیم یافتہ افراد کو مغربی علوم کے

خریجوں جیسے حقوق ملازمت حاصل ہوسکیں۔

۳۔ اس پر مزید حاشیہ ہمارے صاحب بہادر انسپکٹر مدارس نے چڑھایا کہ جامعہ عباسیہ
یں ابتدائی تعلیم سے شروع کرکے ۱۴ سال میں مولوی فاضل منشی فاضل۔ ایف اے یونیورسٹی
ے ساتھ حساب۔ جبر و مقابلہ۔ ہندسہ۔ دیہاتی سائنس مڈل تک مکمل کی جاکر امتحانات ادیب
اردو) وشاد ر (سنسکرت) حکیم حاذق میں سے ایک بھی ضرور پاس کرے۔ اس درجہ کے
فتوں کو بی۔ اے پاس کے حقوق ملازمت ریاست بھر میں حاصل ہوں اور اگر یہ نوجوان دو
ل مزید خالص عربی میں انتہائی (تکمیلی) مضامین حاصل کرلیں تو وہ ایم۔ اے پاس کے برابر تصور

۴۔ حالات پر غور کرتے ہوئے یہ بھی اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں پہلی رہی سہی برکت سلف نہ کھو بیٹھیں
رنہ ہمیشہ ایک ہی وزارت رہتی ہے اور نہ ہی ریاستوں کے کاموں میں اعلیٰ درجہ کی باقاعدگی اور نہ ہی
ارف میں وسعت۔ خاص کر تعلیمی مصارف جن کو بالکل بے فائدہ سمجھا جاتا ہے اور نہ ہی زمانہ کی ضروریات
تار یکساں رہتی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی جناب میں التجائے توفیق کے بغیر چارہ نہیں۔ جناب والا
نکے مرد میداں ہیں۔ لہٰذا آپ سے انہی حالات کا بیان کرنا عین مصلحت ہے۔

۵۔ ترتیب نصاب کے بعد استصواب وصورت انتظام کی خاطر جناب والا سے بھی تشریف آوری کی استدعا
ے گی اور اگر جناب والا مناسب خیال فرمائیں تو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب و سید غلام السیدین صاحب
یصیل بالا بیان کرکے رائے مفصل حاصل کی جائے۔

۶۔ پرنسپل صاحب سے بھی اسی وجہ سے انتظام و مصارف کے متعلق دریافت کرلیا گیا ہے کہ اگر تقریباً یہی نصاب
دوسری شکل پیش آئے تو سابقہ تجربہ سے حالات کی نوعیت کا اطمینان کرلیا جاوے ہمارے انسپکٹر صاحب
کے موافق بہت سے اختصاصی اساتذہ محکمہ تعلیم کو رکھنے پڑیں گے اور بہت کچھ مصارف کا
ہوگا اور یہاں کا کل میزانیہ سالانہ تعلیم پون لاکھ یا لاکھ روپیہ ہے۔

۷۔ تفصیلی جواب سے جلدی مسرور فرمایا جاوے۔

عبداللہ : مدیر مراسلات۔

مطبوعات جدیدہ

مقالات قومی سرسید سمینار (آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس) مرتب جناب ریاض الرحمٰن خاں شروانی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۰۰، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، سلطان جہاں منزل، علی گڑھ۔ یوپی۔

سرسید احمد خاں کے تعلیمی و تہذیبی نظریات، سیاسی خیالات، علی گڑھ تحریک، علامہ اقبال پران کے اثرات اور جدید ہندوستان میں فرزندان علی گڑھ کے کارناموں وغیرہ موضوعات پر قریب پندرہ عمدہ مضامین اس مجموعہ میں شامل ہیں، زیادہ تر مقالہ نگاروں کا تعلق مسلم یونیورسٹی سے ہے لیکن تحریروں میں معروضی انداز نمایاں ہے، فاضل مرتب کا خیال ہے کہ ان مضامین میں موافق و مخالف دونوں پہلو شامل ہیں، لیکن ان تمام تحریروں میں اس کا احساس قطعی نہیں ہوتا عموماً یہ مضامین مختصر ہیں لیکن جامعیت اور موضوع پر ارتکاز نے ان کو بڑا مفید بنا دیا ہے، فاضل مرتب کے پیش لفظ میں سرسید کے عہد، علمار سے تعلق اور سرسید کے تعلیمی و سیاسی مقاصد پر بنیادی باتیں آگئی ہیں، البتہ یہ صراحت نہیں ملتی کہ یہ سمینار کب ہوا؟ اس کی مختصر روداد ضروری تھی، سرسید کے سلسلے میں اس مجموعہ مضامین کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں۔

اسوۂ حسنہ کے آئینے میں از جناب مولانا سعید الرحمٰن ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وکتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۳۰۴، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ فردوس، مکارم نگر (بروليا) لکھنؤ۔

جناب رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے چند جلوؤں کو سمیٹ کر اس کتاب میں اس مقصد سے

یا گیا ہے کہ " چند لفظوں کا گلدستہ سجا کر رحمت للعلمین ؐ کے غلاموں کی صف میں کھڑے
کے قابل ہوا جا سکے"۔ فاضل مصنف اردو اور عربی زبان کے مشاق اہل قلم اور ادیب
کتاب میں ان دونوں زبانوں کی خطابت و بلاغت اور دل کشی اور سلاست کی خوبیاں
یا کتاب تین حصوں یعنی مختصر حالات سیرت، چند فدائیان رسول ؐ اور سیرت طیبہ
رتخ کے آئینے میں منقسم ہے، اختصار و ایجاز کے باوجود ہر تحریر عقیدت اور اصلاح
کے جذبات سے لبریز ہے، سیرت طیبہ اور عصر حاضر کے مسائل، انسان کی تعمیر،
دائمی پیغام راہِ نبوت، اخلاقی تعلیم، ہجرت، زندہ قوم کی علامت، دنیا کی زندگی کی اصل
مثالی زندگی، اخلاق ایک لازوال طاقت جیسے عنوانات سے کتاب کی روح کا اندازہ
ہے، اس کے علاوہ مسنون دعاؤں میں ادب کی جلوہ گری اور ہندوستان میں عربی زبان
رت نگاری کا ارتقا اور قاضی محمد سلیمان منصور پوری صاحب رحمت للعلمین پر عمدہ
یا مقدمہ مولانا عبداللہ عباس ندوی کے قلم سے ہے، تعجب ہے کہ ندوۃ العلماء کے
خدمت سیرت نگاری کے سلسلے میں سیرت نگار اعظم علامہ شبلی کا ذکر ان کے قلم

ں غالب از جناب پروفیسر نثار احمد فاروقی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ
ت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۹۱، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ
مارگ، نئی دہلی ۲

مصنف کی یہ وقیع کتاب قریب تیس سال پہلے شائع ہوئی تھی، مرزا غالب کے چند
وط اور ان کے دیوان کے ایک نو دریافت نسخہ یعنی نسخۂ امروہہ کے تعارف کی
لبیات میں ایک اہم اضافہ قرار دی گئی تھی، اب برسوں بعد اس کے طبع نو کی

نوبت آئی، اس عرصہ میں نسخۂ امروہہ کے متعلق اور غالبیات کے چند اور گوشوں پر فاضل محقق
کی جو تحریریں شائع ہوئیں ان کو بھی اس ایڈیشن میں شامل کر دیا گیا ہے، دیوان غالب بخط غالب
کی روداد اشاعت بھی تفصیل سے بیان کی گئی ہے، ادب میں بے ادبی کی یہ روداد واقعی فسوناک
ہے، ایک تحریر میں مطالعہ غالب کے نئے امکانات کا جائزہ لیا گیا ہے، غالبیات کے نئے محققین
کے لئے یہ مضمون خاص طور پہ کارآمد ہے لیکن یہ کہنا کہ " غالب کے متداول دیوان کی اشاعت
اتنی کثرت سے ہوئی ہے کہ اب اگر دیوان غالب کے کل مطبوعہ اور قلمی نسخے ضائع ہو جائیں
تو اردو والے اس کا دیوان حافظے سے دوبارہ لکھوا سکتے ہیں"۔ مبالغے کی انتہا ہے، الہامی اور
صاحب اعجاز ثابت کئے بغیر بھی دیوان غالب کی عظمت پر ایمان لایا جا سکتا ہے، ایک تحریر
میں مرزا غالب کو یقیناً سب سے بڑا شاعر کہا گیا ہے، یہ سہو کتابت معلوم ہوتا ہے۔

نسیم حجاز از جناب جگن ناتھ آزاد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش
صفحات ۱۶۰، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو،
نئی دہلی۔

جناب جگن ناتھ آزاد کی نظم و نثر کی پاکیزگی اور شائستگی، ان کی شخصیت کے مانند محتاج تعارف
نہیں، دل کی حرارت اور دردمندی اور فکر کی جدت اور تازگی نے ان کی ادبی کاوشوں کو ایسی
لطافت و شرافت عطا کی ہے جس کا اعتراف دل و دماغ کے نور اور بلاغت کے وفور سے کیا گیا
زیر نظر مجموعہ اشعار بھی ان خوبیوں کا آئینہ ہے، جس میں حمد و نعت، سلام و منقبت کے علاوہ
بعض اسلامی اشخاص و اماکن جیسے مولانا آزاد و اقبال اور بابری مسجد پر ان کی نظمیں ہیں، بابری مسجد
کی نظموں سے ان کے کرب و اندوہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، کتاب کا مبسوط مقدمہ صاحب
معارف مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے قلم سے ہے جو گویا جگن ناتھ آزاد کی خدمات کا جامع

جائزہ و تجزیہ ہے ان کی نظر میں" ان نظموں میں اسلامی احساسات و جذبات ہی موجزن نہیں
بلکہ اسلامی تصورات و خیالات کی ترجمانی بھی ہے ... دراصل ان کے مضامین میں رنگ حرم
ست نمایاں ہے"۔ جناب آزاد کے متعلق اہل نظر کا تاثر یہ ہے کہ انھوں نے جن موضوعات سے
رض کیا ہے ان پر کوئی مسلمان فاضل بھی اس سے بہتر کیا لکھے گا۔ یہ مجموعہ بھی اس تاثر سے جدا نہیں۔

صدائے عبرت از جناب مولانا ابوالخیر فاروقی مرحوم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ
وکتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۸۸، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: ربانی بکڈپو،
کٹرہ رحمانیہ، مدن پورہ، وارانسی۔

مولانا ابوالخیر فاروقی مرحوم دیار پورب کے معروف عالم و معلم تھے، وعظ و خطابت میں ان کو
س ملکہ حاصل تھا، یادداشت کی غرض سے تاریخ اسلام کے عبرت آموز واقعات کو وہ قلمبند کرتے رہے،
ء میں ان کا انتقال ہوا تو ان کے سعادت مند وارثوں نے زیر نظر کتاب کی شکل میں اس میراث علمی
ائع کر دیا، سینکڑوں واقعات پر مشتمل یہ مختصر تحریریں اگرچہ کسی قدر بے ترتیب ہیں لیکن عبرت و موعظت
ضمون نے ان کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے، آسان زبان اور پرتاثیر اسلوب سے ان کی افادیت
سوا ہوگئی ہے، شروع میں مولانا مرحوم کی شخصیت پر مضمون بھی ہے۔

گم گشتہ از جناب اعجاز عسکری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد مع گرد
پوش، صفحات ۱۳۱، قیمت ۳۰ روپے، پتہ: ڈاکٹر نسیم اعجاز ۲۷ - دکشنا پورم جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی۔
زندگی کے تلخ تجربات اور زندہ رہنے کا کرب اس مجموعہ کی شکل میں ڈھل گیا ہے، حساس اور کبیدہ خاطر
اس کی اشاعت اس لئے گوارا کی کہ جو دل پہ گزری ہے زمانے کے حوالے کر دیا جائے، انتساب میں ان اشعار کو بے اثر
و بے ثمر سوچوں سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن احساس کی صداقت کی وجہ سے ان کو بے اثر و بے ثمر کہنا شاید زیادتی ہے،
جدیدیت کا اثر نمایاں ہے اور کہیں کہیں بعض معروف محاوروں و استعاروں کا استعمال بار خاطر ہوتا
ہے یاؤں بھاری بھی تھا میاں میں آتا کیسے۔

ع۔ص۔

تصانیف سید صباح الدین عبدالرحمٰن

☆ بزم تیموریہ: اس میں ہندوستان کے تیموری سلاطین کی علم دوستی و علم پروری کی تفصیل عہد بہ عہد ذکر کی گئی ہے۔ قیمت جلد اول ۵۰ روپے جلد دوم ۵۰ روپے سوم ۵۶ روپے

☆ بزم صوفیہ: مشائخ صوفیہ کا تذکرہ اور ان کی مستند سوانح عمری۔ قیمت: ۱۱۵ روپے

☆ اسلام میں مذہبی رواداری: قیمت: ۶۵ روپے

☆ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری: حصہ اول: ۳۰ روپے دوم: ۳۸ روپے۔ سوم: ۵۶ روپے

☆ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے: سلاطین ہند کی معاشرتی و تہذیبی زندگی کی مرقع آرائی کی گئی ہے۔ قیمت: ۸۰ روپے

☆ ہندوستان کے سلاطین علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر: قیمت ۳۵ روپے

☆ عہد مغلیہ میں ہندوستان سے محبت و شیفتگی کے جذبات: قیمت ۴۰ روپے

☆ ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں: قیمت: ۲۵ روپے

☆ حضرت خواجہ معین الدین چشتی: قیمت: ۱۰ روپے

☆ حضرت ابوالحسن ہجویری: قیمت: ۵ روپے

☆ مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر: قیمت: ۲۵ روپے

☆ محمد علی کی یاد میں: قیمت: ۳۵ روپے

☆ بزم رفتگاں: جلد اول زیر طبع، جلد دوم: ۳۵ روپے

☆ غالب مدح و قدح کی روشنی میں: جلد اول زیر طبع جلد دوم: ۵۰ روپے

☆ مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ: قیمت: ۷۰ روپے

☆ مولانا سید سلیمان ندوی کی دینی و علمی خدمات: قیمت ۱۵ روپے

☆ ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک جھلک: قیمت ۸۰ روپے

☆ صوفی امیر خسرو: قیمت ۳۰ روپے